

مسلمان اور سائنس

پروفیسر امیر علی ہود بھائی



مشعل

مسلمان اور سائنس¹

پرویز امیر علی ہود بھائی

The free electronic download of this book has been made possible by the generous financial assistance provided by:
The Eqbal Ahmad Foundation

مشعل بکس

آر بی۔ ۵، سینٹر فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن
لاہور۔ 54600، پاکستان

پروفیسر امیر علی ہود بھائی قائد اعظم یونیورسٹی کے شعبہ فزکس میں پروفیسر ہیں اور پاکستان کے معروف سائنسدانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ہود بھائی نے امریکہ کی بہترین یونیورسٹی ایم آئی ٹی سے BSc, MSc اور PhD کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کے 65 سے زائد تحقیقی مقالے فزکس کے بین الاقوامی جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو بیکر ایوارڈ (شعبہ Electronics) ، عبدالسلام ایوارڈ (شعبہ ریاضی) اور فیض احمد فیض ایوارڈ (شعبہ تعلیم) سے نوازا گیا ہے۔ ڈاکٹر ہود بھائی نے امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھایا ہے اور مختلف لیبارٹریوں میں تحقیقی کام کیے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے تین پروگراموں کے سلسلے بنائے ہیں، جن کا تعلق سائنس اور تعلیم کے ساتھ ہے۔

مسلمان اور سائنس

پرویز امیر علی ہود بھائی

کاپی رائٹ اردو (c) 2005 مشعل بکس

پہلی اشاعت 2002

دوسری اشاعت 2003

تیسری اشاعت 2005

ناشر: مشعل بکس

آر۔بی۔۵، سینڈفلور

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔ 54600، پاکستان

فون و فیکس: 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

<http://www.mashalbooks.org>

فہرست

8	اظہار تشکر
9	دیباچہ
14	پیش لفظ
	باب ایک
17	تعارف
	باب دوم
25	سائنس کیا ہے اور کیسے شروع ہوئی؟
27	حقائق
27	قوانین
28	مفروضات
28	نظریہ
29	استنباط و استقراء
29	سائنسی طریقہ
31	سائنسی اور غیر سائنسی نظریات میں فرق
33	سائنسی طریقہ کار کی ابتداء کیسے ہوئی
36	کیا کوانٹم فزکس نے سائنس کو تباہ کر دیا؟
41	کیا جدید سائنس مغربی سائنس ہے؟
	باب تین
44	کلیسیا اور سائنس کا ٹکراؤ
	باب چار

53	اسلامی ملکوں میں سائنس کی موجودہ حالت
55	سائنس کی پیمائش
55	پیداواری عمل میں سائنس کا استعمال
59	سائنس اور سائنس دان
63	تعلیمی نظام میں سائنس کا مقام
75	سائنس کا صحیح نظر
	باب پانچ
80	پسماندگی کے اسباب، مسلمانوں کے تین تجربے
84	احیاء اسلام
89	اجتہادی رویہ
89	سید احمد خان
92	سید امیر علی
95	علیت پسندوں کا رویہ
100	حاصل کلام
	باب چھ
101	بکائیل، نصر اور سردار..... اسلامی سائنس کے تین مبلغ
107	سید حسین نصر
115	ضیاء الدین سردار
	باب سات
118	کیا سائنس اسلامی بھی ہو سکتی ہے؟
123	کیا مارکسی سائنس ہے یا ہو سکتی ہے؟
126	تیسری دنیا کی سائنس
	باب آٹھ
129	مسلم سائنس کا عروج

- 132 یہ اسلامی سائنس تھی یا مسلم سائنس؟
 135 کیا مسلمانوں کے سنہری دور کی سائنس عرب سائنس تھی؟
 138 کیا ازمینہ وسطے کے مسلم معاشرے نے سائنس کو قبول کر لیا تھا؟

باب نو

- 143 مذہبی کٹرپن اور مسلم سائنس
 145 کٹرپن کے خلاف معتزلہ کی بغاوت
 151 کٹرپن کا جوابی حملہ
 155 الغزالی کے ہاتھوں عقل پرستوں کی شکست فاش
 156 علت اور معلول کے متعلق غزالی کا نظریہ
 157 ریاضی اور سائنس پر غزالی کے خیالات
 159 تجربی علم پر غزالی کا نظریہ

باب دس

- 161 پانچ بڑے بدعتی
 162 اکندی
 164 الرازی
 165 ابن سینا
 168 ابن رشد
 170 ابن خلدون

باب گیارہ

- 173 اسلامی دنیا میں سائنسی انقلاب کیوں نہیں آیا؟
 175 رویوں یا انداز فکر پر مبنی اسباب
 180 مسلم تعلیم کا کردار
 181 روایتی تعلیم
 181 جدید تعلیم

186	مسلم قانون کارول
189	اقتصادی اسباب
190	استخراجی اقتصادیات
191	خود مختار ادارے
193	سیاسی اسباب
	باب بارہ
196	مستقبل کے لیے کچھ معروضات
	باب تیرہ
204	اسلامی سائنس کیا ہے؟
205	سائنسی معجزات کی کانفرنس
206	اسلامی سائنس کے عجیب و غریب نتائج
211	کیا یہ سائنس ہے؟
213	اصول تکذیب سائنس کی کسوٹی
216	حقیقت میں اسلامی سائنس کیا ہے؟
218	سیاسی جڑیں

اظہار تشکر

یہ کتاب دس سال پہلے انگریزی زبان میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اردو میں لکھنا چاہا لیکن مختلف مصروفیات کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ ہو سکا۔ اس کے بعد چند دوستوں نے اس کا ترجمہ کرنے کی پیش کش کی اور اس میں سب سے نمایاں کردار جناب احسن علی خان مرحوم نے ادا کیا۔ وہ ایک مانے ہوئے ادیب اور دانشور تھے اور انہوں نے یہ کام نہایت محنت اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس کے لئے میں مرحوم کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ سید محمد حامد اور جمیل عمر نے بھی کتاب کے مختلف حصوں کا ترجمہ کیا تھا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ لیکن یہ کام پایہ تکمیل تک اس وقت پہنچا جب اردو سائنس بورڈ نے اسے شائع کرنے کی پیش کش کی اور اسے جلد مکمل کرنے کے لئے مجھے مجبور کیا۔ لیکن وہ بھی یہ کتاب شائع نہ کر سکے۔ اب مشعل یہ کتاب شائع کر رہا ہے۔ آخر میں میں جناب خادم حسین کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ انہوں نے میرے ساتھ مل کر سارے مسودے پر نظر ثانی کی اور اسے آخری شکل دی۔

پروفیسر امیر علی ہود بھائی
اسلام آباد 2002ء

دیباچہ

”اس میں کوئی شک نہیں کہ کرہ ارض پر تمام ممالک میں سے اسلامی ممالک سائنس کے میدان میں سب سے پسماندہ ہیں۔ اس کمزوری کے خطرات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ آج کل کے زمانے میں کسی معاشرے کی بقا کا انحصار اس میں موجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی و ترویج پر ہے۔“

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی خواہش کا اظہار کرنے کے بعد مجھے اپنا وعدہ ان الفاظ میں یاد دلایا: ”یاد کیجئے کہ آپ اس شرط پر دیباچہ لکھنے کے لئے رضا مند ہوئے تھے کہ آپ کتاب میں بیان کردہ خیالات سے متفق ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ کو کوئی سنگین اختلاف نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ کو اس کے کچھ حصوں سے اختلاف ہو تو بھی میں چاہتا ہوں کہ آپ نہ لکھنے کی بجائے ایک تنقیدی مضمون لکھیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک مختلف نقطہ نظر کے اضافے سے کتاب میں توازن پیدا ہوگا۔“ کتاب میں لکھی گئی کسی بھی بات سے میں اختلاف نہیں کر سکا۔ اس کے برعکس:

(الف) میں ڈاکٹر ہود بھائی کی اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ اسلامی دنیا میں سائنس کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ (میں اس اقتباس کا اعادہ کرتا ہوں جو اس صفحہ کے شروع میں ہے اور جس سے کتاب کا چوتھا باب شروع ہوتا ہے)

(ب) مذہبی کٹر پن اور عدم رواداری ایسے عناصر ہیں جو اسلام کے گزشتہ دور میں سائنس کی

پھلتی پھولتی زندگی کو ختم کرنے کے ذمہ دار تھے۔ سائنس اس صورت میں فروغ پاتی ہے جب اس پر کام کرنے والوں کی ایک خاصی تعداد نے اپنا حلقہ بنا لیا ہو سائنس دان سنجیدگی کے ساتھ کام کر رہے ہوں اور انہیں تجرباتی و کتابی سہولتیں حاصل ہوں اور وہ ایک دوسرے کے کاموں پر کھلے طور پر تنقید بھی کر سکتے ہوں۔ یہ شرائط عصر حاضر کا اسلام پورا نہیں کرتا۔

(ج) میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ سید حسین نصر اور ضیاء الدین سردار تہذیب و تمدن کی جگہ مذہب کو سائنس کا محرک بنا کر درحقیقت سائنس کو بہت نقصان پہنچا رہے ہیں۔ میں اس بیان سے اتفاق کرتا ہوں کہ صرف ایک عالمی سائنس کا وجود ہے اور اس کے مسائل نیز طریقہ ہائے کار بین الاقوامی ہیں۔ اسی طرح، جس طرح ہندو سائنس، یہودی سائنس، کنفیوشسی سائنس، عیسائی سائنس، وغیرہ جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

(د) میں اس بات سے متفق ہوں کہ جس قسم کی اسلامی سائنس کی حوصلہ افزائی صدر ضیاء الحق نے کی، وہ ڈھونگ تھی اور اس پر جن سائنس دانوں نے عمل کیا (اور ان سائنس دانوں کو بجا طور پر ہود بھائی نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے) ان کو ایسے کاموں پر شرمندہ ہونا چاہیے جو انہوں نے سائنس کے نام پر کئے ہیں۔

(ہ) میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ عملیت اور حقیقت پسندی ایک ایسا طریق کار فراہم کر سکتی ہے جس کے ذریعہ مسلم ممالک میں حقیقی سائنس دوبارہ پروان چڑھ سکتی ہے۔ مجھے البتہ یہ اعتراض ضرور ہے کہ اپنے تجربے کے آخری حصہ کو ہود بھائی نے کما حقہ آگے نہیں بڑھایا ہے۔

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصہ ان ابواب پر مشتمل ہے جو مسلم دنیا میں سائنس اور تعلیم کی صورت حال کو بیان کرتے ہیں۔ دوسرا حصہ ان ابواب پر مشتمل ہے جو اسلام میں سائنس کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور سائنس کی ان تشریحات کا جائزہ لیتے ہیں جو ضیاء کے دور میں پاکستان میں کی گئی ہیں۔

میں پہلے اس کتاب کی خوبیاں بیان کروں گا۔ مثال کے طور پر کیتھولک مذہب اور سائنس کے درمیان صدیوں پر پھیلی ہوئی لڑائی (جس کی دس مثالیں دی گئی ہیں) کے متعلق باب کلی طور پر بہترین ہے۔ اس طرح مصنف اسٹیون وینبرگ اور میرے کام کا حوالہ دے کر کہتا ہے کہ اس

وجہ سے ہم دونوں کے کام میں کوئی بنیادی فرق نہیں پڑا کہ میں ”خدا پر پکا یقین رکھنے والا اور واٹن برگ پکا لحد ہے“۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ مصنف نے سچ کہا ہے۔ ہم دونوں جغرافیائی اور نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ اس کے باوجود ایک ہی وقت میں ہم نے کمزور اور برقیاتی مقناطیسی قوتوں کو متحد کرنے کا ایک ہی نظریہ طبعیات دریافت کیا۔ اگر میری سوچ میں قوتوں کے اتحاد کا کوئی تصور تھا تو وہ غیر شعوری طور پر میرے اسلامی پس منظر سے ماخوذ تھا۔ مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ اسلامی تاریخ میں سائنس کے مقام کا جائزہ لیا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا، میرا واحد اعتراض یہ ہے کہ ہود بھائی نے وضاحت کے ساتھ یہ نہیں بتایا کہ ہماری صورت حال کا علاج کیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ یہ بنیادی سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا اسلام میں سائنس ہمیشہ کے لئے مرچکی ہے؟ یا یہ اس وقت تک زندہ نہیں ہوگی جب تک کہ مسلمان کٹر پن نہیں چھوڑیں گے؟ ہود بھائی اپنی کتاب میں اس بحث کو آخری منزل تک نہیں پہنچاتے۔

ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آج کی اسلامی دنیا قدرتی طور پر مختلف ثقافتی حصوں میں منقسم ہے۔ جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کا سوال ہے یہاں بھی اسلامی دنیا قدرتی طور پر مختلف ثقافتی و تہذیبی حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مجھے اس نکتہ کو واضح کرنے کی اجازت دیجئے

1- خلیجی ریاستوں کے عربوں کے پاس بہت دولت ہے۔ وہ چاہتے تو تمام اسلامی دنیا میں سائنس کو فروغ دینے کا ذمہ لے سکتے تھے۔ وہ اب بھی یہ کام کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے دنیائے اسلام کو تو کجا دنیائے عرب کے لئے بھی ایسی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کی ہے۔

2- چوتھے باب میں ہود بھائی انسٹی ٹیوٹ آف سائنٹیفک انفارمیشن کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ علی الترتیب مصر، ایران، پاکستان، ناٹجیر یا ترکی، ملائیشیا اور لبنان نے 1976ء کے دوران سب سے زیادہ سائنسی لٹریچر پیدا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مصر میں سائنس دانوں کی تعداد دیگر مسلم ممالک کی نسبت زیادہ ہے لیکن انجینئرنگ اور کم درجہ کی ٹیکنالوجی کو چھوڑ کر دیگر سائنسی شعبوں میں مصریوں کا معیار چنداں بلند نہیں ہے۔

3- ایران و عراق کے درمیان جنگ ختم ہونے کے بعد ایران اب اس حیثیت میں ہے کہ سائنس میں اپنی قدیم فضیلت کو دوبارہ حاصل کر لے۔ میں نے ایران کے جوانوں میں علم کی

تفنگی دیکھی ہے اور میں نے حالیہ دورے کے دوران خود دیکھا ہے کہ ایران کے شیعہ علماء بھی سائنسی علوم کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔

4- پاکستان کو ایک ایسے حکمران کا انتظار ہے جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی ایسی ہی لگن ہو جیسی کہ ہندوستانی سائنس کی ترقی کے لئے جواہر لال نہرو کے دل میں تھی۔

5- انڈونیشیا کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں اس ملک کو اچھی طرح نہیں جانتا۔

6- گو بنگلہ دیش کے جوان مردوں اور عورتوں میں سائنس کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی بڑی خواہش ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس ملک میں مفلوک الحالی سائنسی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

7- دنیائے اسلام میں دیگر ممالک کم اہمیت کے حامل ہیں۔ البتہ سوڈان میں سب سے زیادہ محنتی سائنس دان پائے جاتے ہیں۔ ترکی یورپ میں شامل ہونے کی خواہش کے باعث سائنس کے میدان میں ترقی کر سکتا ہے۔ الجیریا کے لوگ اپنی بھرپور توانائی کے باعث اور شاید تیونس اور عراق بھی سائنس کی راہ پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

یعنی اس کتاب میں ایک بہت درست بات اسلام میں علماء کے مرتبے سے متعلق کہی گئی ہے یعنی اسلام میں کوئی کلیسا نہیں تھا اور نہ ہی مذہبی اختیارات کا کوئی واحد مرکز تھا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اگر ایک طرف فرد کو اخلاقی طور پر یہ اختیار تھا کہ وہ ملاؤں کی مدد کے بغیر نظریے کی تفسیر کر سکتا تھا تو دوسری طرف اس کی وجہ سے ایک تنظیمی کمزوری بھی پیدا ہوئی جو آخر کار سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کے لئے ہی نہیں بلکہ اسلام کی سیاسی اور اقتصادی قوت کے لئے بھی مہلک ثابت ہوئی۔

میں علماء سے پوچھتا رہا ہوں کہ وہ اپنے وعظ میں مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی تلقین کیوں نہیں کرتے۔ یہ نصیحت آٹھ میں سے کم از کم ایک وعظ میں تو ہونی چاہیے کیونکہ قرآن حکیم کا کم از کم آٹھواں حصہ تو ”تفکر“ اور ”تسخیر“ یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق ہے۔ علماء میں سے زیادہ تر کا جواب یہ ہوتا ہے کہ وہ یہ تلقین کرنا پسند کریں گے، لیکن وہ جدید سائنس سے کافی واقفیت نہیں رکھتے۔ وہ تو صرف ابن سینا کے عہد کی سائنس جانتے ہیں۔ تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز (جسے ہود بھائی کی اس کتاب کے جزوی کفیل ہونے کی

سعادت حاصل ہے) اس صورت حال کا علاج ایسی کتابیں لکھوا کر کر رہی ہے جو ان کی مذہبی درس گاہوں کے نصاب میں شامل کی جاسکیں۔

آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ ہمارے اسلامی ملکوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کو ترقی دینے کے لئے مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل درآمد کرنے کی ضرورت ہے۔

1- سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت حاصل کرنے والوں کی تعداد اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ معاشرے میں تبدیلی کا ماحول پیدا کر سکیں پھر ان سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے کہ وہ تحقیق و ترقی کے لئے اپنی ایسی انجمنیں بنائیں جن کا اپنا ضابطہ اخلاق اور طریقہ کار ہو۔

2- ہمیں خالص سائنسی مضامین کے ماہر چاہئیں جو تعلیم دے سکیں اور عملی سائنس اور اعلیٰ ٹیکنالوجی اختیار کرنے والوں کے لئے رہبری کے فرائض انجام دے سکیں۔

3- یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آج کے زمانے میں عملی سائنس اور اعلیٰ ٹیکنالوجی دولت کے سرچشمہ ہیں۔ ایک بار دولت کمانے کی اس اہلیت کا عملی مظاہرہ کر دیا جائے تو پھر حکمرانوں اور علماء کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے کاموں میں دخل دینا مشکل ہو جائے گا۔

4- مسلم اہل سائنس پر لازم ہے کہ وہ دوسرے ملکوں میں اپنے ہم پیشہ سائنس دانوں سے بین الاقوامی تعلق قائم رکھیں تاکہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں وہی معیار حاصل کر سکیں جو بین الاقوامی طور پر رائج ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں جن کی بنا پر سائنسی ترقی کے ضمن میں ہمیں پر امید رہنا چاہیے۔ مثال کے طور پر پچیس سال کی مسلسل تگ و دو کے بعد پہلی بار خلیج سے کچھ قوم فراہم کی گئی ہیں۔ یہ قوم کویت میں قائم عرب فنڈ فار اکنامکس اینڈ سوشل ڈویلپمنٹ کی طرف سے ملے ہیں، جن میں سے اس سال ٹرسٹ سنٹر کو عربوں کے لئے اڈھائی لاکھ ڈالر دیئے گئے ہیں۔ اگر ہم کو ایسی ہی قوم دوسرے مسلمانوں کے لئے بھی مل سکیں تو اسلامی ممالک میں کم از کم فزکس کا مستقبل نسبتاً زیادہ روشن ہوگا۔

ڈاکٹر عبدالسلام (مرحوم)

1990ء

پیش لفظ

یہ کتاب میں نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں لکھی بلکہ ملک کی صورت حال نے مجھے اپنے قلم کو جنبش دینے پر مجبور کیا۔ اس کتاب کے خیال کی ابتدا اسلام اور سائنس کے موضوع پر اس لیکچر سے ہوئی جو میں نے مئی 1984ء میں لاہور ایجوکیشن سوسائٹی کی دعوت پر دیا تھا۔ وہ زمانہ ملک کے لئے عموماً اور اہل قلم کے لئے خصوصاً ایک مشکل دور تھا۔ سرکاری لائن سے انحراف برداشت نہیں کیا جاتا تھا، یونیورسٹیوں کے کئی پروفیسر (جن میں قائد اعظم یونیورسٹی کے میرے کچھ ساتھی بھی شامل تھے) صرف اس لئے قید و بند اور اذیتوں کے مستحق ٹھہرے کہ انہوں نے ایسے نظریات اور آراء کے اظہار کی جسارت کی جو حکمرانوں کو ناپسند تھے۔

اس دور میں اسلام کے متعلق نئی حکومت کے اقدامات اور منصوبوں کو تقویت پہنچانے کے لئے خوشامدی حضرات معاشرے کی ہر چیز کو اسلامی بنانے کی دھن میں لگ گئے۔ حتیٰ کہ سائنس بھی اس عمل سے محفوظ نہ رہ سکی۔ پاکستان کے سائنسی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد اس کام کے بہت بڑے حامی تھے۔ اپنی ساکھ بنانے اور حاکم وقت کی خوشامد کے لئے ان نام نہاد سائنس دانوں نے دلیل و منطق کو ہی نہیں بلکہ دین اسلام کی ہر عقلی تفسیر کو بھی پامال کیا۔ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ انہوں نے مختلف اوٹ پٹانگ دریا فتوں کا دعویٰ کیا۔ مثال کے طور پر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کے ذریعہ یہ دریافت کیا کہ جنت ہم سے دور بھاگتی جا رہی ہے اور اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے ایک سینٹی میٹر فی سیکنڈ کم ہے۔ پھر ایک ڈاکٹر صاحب جو

پاکستان اٹاک انرجی کمیشن کے ڈائریکٹر تھے، فرمانے لگے کہ انہوں نے قرآن شریف کے مطالعے سے یہ معلوم کیا ہے کہ جنات ایک آزاد اور آتشی مخلوق ہیں جن میں بے پناہ توانائی پوشیدہ ہے۔ لہذا وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس آتشی قوت کو ایندھن کے طور پر استعمال میں لایا جا سکتا ہے تاکہ تیل کے بحران کا مستقل حل نکالا جاسکے۔ یہ نتائج اکثر اوقات کثیر رقوم سے منعقدہ بڑی بڑی قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں پیش کئے گئے اور انہیں سائنس کے مقامی جرائد میں بھی شائع کیا گیا۔ لاہور ایجوکیشن سوسائٹی نے مجھے یہ موقع فراہم کیا کہ میں اس عمل کا تجربہ کروں اور یہ حوصلہ دیا کہ اسلام اور سائنس کے موضوع پر مزید غور و فکر کر کے کچھ لکھوں۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ان موضوعات پر اپنی تحریروں کو یکجا کر کے کتابی شکل دینا زیادہ مفید ہوگا۔ تاہم میں یہ بات صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں اور نہ ہی کتاب کے موضوع ”اسلام اور سائنس“ یا سائنس کے فلسفہ پر عبور کا دعویٰ کرتا ہوں۔ خصوصی مطالعہ کے دیگر علمی شعبوں کی طرح ان موضوعات کی تفہیم کے لئے بھی صبر آزما تحقیق کی ایک زندگی درکار ہوتی ہے۔ اس لئے کچھ پس و پیش کے بعد میں ایک ایسے علمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گیا جو میرے پیشہ وارانہ شعبے (یعنی پارٹیکل اور نیوکلیائی طبیعیات) سے بہت دور ہے۔ لیکن اسلام اور سائنس کے درمیان تعلق کی تفہیم عصر حاضر میں اتنی زیادہ اہمیت کی حامل ہے اور اس میں دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے پر گہرے اثرات ڈالنے کے اتنے امکانات ہیں کہ مجھے یہ کام کرنا ہی پڑا۔ اگر اس موضوع میں پیشہ وارانہ دل چسپی رکھنے والا کوئی شخص یہ کام کرتا تو بہت بہتر ہوتا۔ لیکن ایسے شخص کے انتظار میں بیٹھے رہنا بعید از دانش ہوتا۔ چنانچہ اسلام کے ماضی و حال میں سائنس کا مقام تلاش کرنے کی بھلی یا بری کوشش کے نتائج قاری کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب رہی؟ اس کا فیصلہ قاری کو کرنا ہے۔

میں اپنے قریبی دوستوں کا ممنون ہوں۔ قائد اعظم یونیورسٹی میں شعبہ طبیعیات (جس میں میری پیشہ وارانہ زندگی کا زیادہ وقت گزرا ہے) کو میرے ساتھیوں نے اس وقت ہوش مندی کا ایک جزیرہ بنائے رکھا، جب کہ معاشرے کا بڑا حصہ فکری انتشار میں مبتلا تھا۔ ان ساتھیوں میں سے دو دوستوں کا بطور خاص ذکر کروں گا۔ ایک عبدالحمید نیر، جن سے میں ان افکار پر تبادلہ

خیالات کرتا رہا؛ جو اس کتاب میں درج ہیں؛ ان کی فکری فصاحت، خلوص مقصد اور باریک بینی کی وجہ سے اس کتاب میں کئی اصلاحات ممکن ہو سکیں۔ میرے دوسرے دوست شعبہ فزکس کے بزرگ ساتھی عارف الزمان ہیں جن کی تاریخ سے متعلق ہمہ گیر معلومات سے میں نے بہت استفادہ کیا اور جن کا ناقابل شکست احساس تشکیک مجھے ہمیشہ مثبت پہلوؤں کی تلاش پر اکساتا رہا۔ اس کے علاوہ میں خورشید حسین کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس کتاب کے مسودے کا بغور مطالعہ کیا اور مفید تجاویز دیں۔

میں ڈاکٹر اقبال احمد کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مسودے کا باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ اس موقع پر میرے لئے یہ اقرار کرنا مناسب ہوگا کہ میرے خیالات اور نظریات ڈاکٹر اقبال احمد کی شخصیت اور تحریروں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ سمندر پار سے میرے دوست ضیاء میاں نے مجھے نفس مضمون سے متعلق متعدد تحریروں اور تجزیے ارسال کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی تنقید بھی کی جو مفید ثابت ہوئی۔ میں ہارورڈ یونیورسٹی کے تاریخ سائنس کے شعبہ کی النور دھنانی کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے کچھ مفید کتب اور حوالہ جات کی نشاندہی کی؛ کتاب کے متن کو غور سے پڑھا اور کچھ تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی۔ میں تھرڈ ورلڈ اکیڈمی آف سائنسز کا احسان مند ہوں کہ اس نے چند اہم حوالہ جات خریدنے کے لیے رقم فراہم کی۔

میرے والدین اور خاندان کی جو عنایات اور احسانات مجھ پر ہیں ان کا حساب ناممکن ہے اور آخر میں ہاجرہ آشا اور عالیہ کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔ ان کی محبت اور مدد کی وجہ سے ہی زندگی خوشگوار اور بامعنی ہے۔

پرویز امیر علی ہود بھائی

اسلام آباد 1990ء

باب ایک

تعارف

گزشتہ ایک ہزار سال سے اسلامی دنیا کے دانشور، فقہا اور مجتہدین اس سوال پر غور و خوض کرتے آئے ہیں کہ آیا اسلامی عقائد اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا اختلاف؟

یہ سوال عصر حاضر میں مزید غور و فکر کا متقاضی ہے؛ کیونکہ زمانہ جدید میں کسی ملک کے وقار کا دار و مدار اس کی سائنسی مہارت اور تکنیکی اہلیت پر ہے۔ آج سائنس کی مدد سے انسان نے نہ صرف ایٹم سے باریک تر ذرات کو دیکھ اور سمجھ لیا ہے بلکہ یہ بھی جان لیا ہے کہ کائنات کب اور کیسے وجود میں آئی اور اس کے نظام میں کون سے قوانین کارفرما ہیں۔

بے شمار مسلمان مفکرین اور علماء نے اس سوال کے بارے میں اپنے اپنے مسلک اور نظریات کے پیش نظر توجیہ و تشریح کی ہے۔ چنانچہ اسلامی روایات و تاریخ کے ایک ہی ذخیرہ سے متضاد نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اس لئے اسلامی دنیا میں مختلف مکاتب فکر کے مابین ہم آہنگی کا پیدا ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے لیکن اس مسئلہ کو لاشعور کی گہرائیوں میں غرق کرنا یا اس سے چشم پوشی کرنا اب ناممکن ہے کیونکہ جوں جوں بیسویں صدی اختتام کو پہنچ رہی ہے، مسلم معاشرے کے لئے یہ اشد ضروری ہوتا جا رہا ہے کہ سائنس کے بارے میں اسلام ایک مثبت موقف اختیار کرے۔

اب ویسا زمانہ نہیں؛ جب ہارون الرشید اور مامون رشید کے شاندار درباروں میں سائنس روشن

خیال شہزادوں کے لئے محض تفریح طبع کا ذریعہ تھی یا علماء کے درمیان ”منظروں“ کے لئے مواد فراہم کرتی تھی۔ اب تو یہ تمام انسانی تہذیب میں اچھی یا بری مگر ناقابل تنسیخ، تبدیلی لانے کا وسیلہ ہے۔ زمانہ جدید کی اقوام کی سیاسی قوت اور معاشی خوش حالی اس بات پر منحصر ہے کہ ان میں جدید سائنس کو سمجھنے، اس سے استفادہ کرنے اور اس کو تخلیق کرنے کی کتنی قابلیت ہے۔ جہاں بھی لوگ اس کے حصول میں ناکام رہے وہاں انہیں تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اسلامی تہذیب نے سائنس سے بے بہرہ ہونے کی بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔

اگر تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی تہذیب کی پسپائی اور مغرب کے عروج کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ ازمنہ وسطیٰ میں مغرب سے اسلام کے رشتے کی نوعیت آج سے مختلف تھی۔ اس دور میں ایسے زمانے بھی آئے، جب دونوں کے درمیان باہمی طور پر سود مند تعاون رہا اور ایسے کڑے وقت بھی گزرے، جب جنگیں ہوئیں۔ ہسپانیہ (اسپین) پر مسلمانوں نے سات صدیوں تک حکومت کی۔ اس دور میں مسلمانوں نے یورپ کے لوگوں کو یونانیوں اور مسلمانوں کے صدیوں سے جمع شدہ علمی خزانوں سے روشناس کرایا۔ لیکن دوسری طرف صلیبی جنگوں کے دوران طویل دشمنی اور اس کے بعد بلقان پر ترکوں کے غلبہ نے دونوں طرف تعصب اور نفرت کی یادیں بھی چھوڑیں۔ دشمنی کے اس تلخ تجربے نے دونوں تہذیبوں کے درمیان اختلافات کو مزید اجاگر کیا۔ اس کے باوجود جیسا کہ ڈاکٹر اقبال احمد نے نہایت عمدہ انداز میں واضح کیا ہے کہ اسلامی اور مغربی معاشروں کی ساخت بنیادی طور پر ایک جیسی تھی۔

”نہ صرف یہ کہ ہماری ثقافتیں روایتی پرانی اور ازمنہ وسطیٰ کی تھیں بلکہ ان کے درمیان ایک ساختیاتی مماثلت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے دونوں کے مابین خیالات اور پیداواری اجناس و اشیاء کا تبادلہ برابری کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ فاتح اور مفتوح ایک ہی قسم کے ہتھیار بناتے اور استعمال کرتے تھے۔ تقریباً ایک ہی قسم کی اشیاء کا لین دین کرتے تھے اور ایک جیسے موضوعات زیر بحث لاتے تھے۔ طبقاتی مفادات میں ایک قسم کی مماثلت پائی جاتی تھی اور اشرافیہ دستکاروں، تاجروں اور عالموں کے رویے مشترک تھے۔۔۔۔۔“ (1)

پھر یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور آیا اور جدید سائنس کی ابتدا ہوئی۔ سترھویں اور اٹھارویں

صدیاں اس خطے میں صنعتی انقلاب، سیاسی انقلاب اور روشن خیالی کا زمانہ تھیں۔ ڈیکارٹ، نیوٹن، والٹیئر، روسو، ڈیڈرو، کانٹ بے شمار ایسے مفکرین اور سائنس دان پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرے کے افکار اور اقدار کا رخ بدل دیا۔ ایک نئی بحث شروع ہوئی جو فقط عقل کی حاکمیت قبول کرتی اور جس کے استدلال کی بنیادیں منقولاتی نہیں بلکہ تجرباتی تھیں۔ کسی مفروضے کو ثابت کرنے کے لئے کسی بڑے شخص کا سہارا نہیں لیا جاتا بلکہ اس کو تجربوں سے ثابت یا رد کیا جاتا۔ چنانچہ اس عمل میں تخلیقی قوتیں مسلسل کارفرما رہتی ہیں۔ اس سائنس نے ایک واضح عقلی طریق کار کے ذریعہ مادی کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انسانی تاریخ میں پہلی بار پراسرار کائنات کی شناخت ایک ایسے باضابطہ اور باقاعدہ طریقہ کار کے تحت ہوئی جو عقل کی دسترس میں ہے۔ سائنسی طریق کار پر عبور رکھنے والوں کو وہ طاقت حاصل ہوئی جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس طاقت کا کچھ حصہ قدرت کے قوانین کے سمجھنے اور بعد میں جدید مصنوعات کی ایجاد میں کام آیا۔ لیکن اسی طاقت کا کچھ حصہ دنیا کے کم ترقی یافتہ لوگوں پر غلبہ پانے اور ان پر نوآبادیاتی نظام مسلط کرنے کے لئے بھی استعمال ہوا۔

اٹھارہویں صدی کی سامراجی یلغار کے خلاف مسلمانوں کے روایتی معاشرے کے پاس کوئی ذریعہ دفاع نہیں تھا۔ مغربی افریقہ سے لے کر مشرقی ایشیا تک تقریباً تمام دنیائے اسلام تیزی کے ساتھ مغربی نوآبادیاتی نظام کے تسلط میں آ گئی۔ یہ ایک ایسی تہذیب کے لئے نہایت ذلت آمیز مقام تھا جو ابھی تک صرف فتوحات کی ہی عادی رہی تھی۔ دراصل جدید سامراجیت کی طاقت مسلح افراد کی تعداد پر نہیں بلکہ جدید سائنس کے تجزیاتی طریق کار (سائنٹیفک میٹھڈ) پر مبنی تھی اور اتنی طاقتور کہ پہلی ہی ضرب نے مسلمانوں کو ایسا مفلوج کیا کہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا کیونکہ یہ برابر کا مقابلہ نہیں تھا۔ سامراجیت ایک پیچیدہ نظام تھا۔ یہ ایک سینکڑوں پرزوں پر مشتمل طاقتور مشین تھی، جس کا ہر پرزہ ٹھیک ٹھیک اور وقت پر حرکت کرتا تھا۔ اس کی طاقت کا سرچشمہ رانفلیس اور توپیں نہیں تھیں، جو 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں استعمال کی گئیں بلکہ اس سامراجی عفریت کی اصل طاقت دخانی جہاز، ٹیلیگراف، ساز و سامان اور جدید تنظیمی طریقوں میں مضمر تھی۔ ان چیزوں سے مسلمانوں کی زرعی اور قدیم تہذیبیں نا آشنا تھیں۔ جدید فن حرب سے ناواقف فوجیں گو بہت بہادری سے لڑیں لیکن تعداد میں ان سے

بہت کم برطانوی یا فرانسیسی فوجوں نے اپنے جدید ہتھیاروں اور بہتر فن حرب سے ان پر غلبہ پا لیا۔ یاد رہے کہ برصغیر میں انگریز فوج کی تعداد کبھی بھی پچاس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ اب مغرب اور دنیائے اسلام کے درمیان وہ مماثلت ختم ہو چکی تھی، جو صدیوں سے ان کے تعلقات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ جب کسی صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ ایک روایتی اور فرسودہ جاگیرداری نظام سے ہو تو نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ غلبہ حاصل کرنے کے بعد جدید سامراجیت نے نوآبادیات کے عوام کو ”مہذب“ بنانے کے کام کا آغاز کیا، جس کے نتیجہ میں ایسی لوگ شدید مصائب و آلام سے دوچار ہوئے اور ان کی روایتی ثقافت تباہ ہونے لگی۔ سامراجیت نے جو زخم لگائے تھے وہ ہنوز مندمل نہیں ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام ختم ہونے لگا۔ مغربی سامراج سے مقابلے کے نتیجہ میں دنیائے اسلام کے روایتی معاشی، عمرانی، ثقافتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو چکے تھے، اس لئے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا میں مسلمان منتشر اور شکستہ ذہن لے کر داخل ہوئے۔ یہ وہ دنیا تھی جس کی تشکیل میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ کئی موجودہ مسلمان مملکتوں کی سرحدیں بھی مغربی آقاؤں نے اپنی ضروریات یا مرضی سے کھینچی تھیں۔ آزادی کے ساتھ توقعات اور خوش فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن صیہونی یہودیوں کے ہاتھوں فلسطینی عرب اپنے وطن کے حق سے محروم ہوئے، اس کے بعد اسرائیل کے خلاف میدان جنگ میں عرب مملکتوں کی شکست ہوئی۔ پھر جمہوری اداروں کے قیام میں مسلمان معاشروں کی ناکامی نے تمام توقعات اور خوش فہمیاں بتدریج ختم کر دیں۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ دنیا میں قومی یا اشتراکی حکومتیں (مثلاً ایران میں مصدق، مصر میں ناصر، انڈونیشیا میں سوئیکارنو اور پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومتیں) ختم ہونے پر لوگ بہت زیادہ مایوسی اور بے دلی کا شکار ہو گئے، جس کی وجہ سے جدید بنیاد پرستی کی تحریکوں کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ مسلمان ملکوں میں فوج، افسر شاہی یا قبائلی اور جاگیردار اشرافیہ (جس کا خاص مقصد اپنے طبقاتی اور حکومتی مفادات کا تحفظ ہوتا ہے) کا غلبہ عام ہو گیا۔ ان استحصالی طبقوں کی اشرافیہ میں جدید دنیا کے ان گنت مسئلوں اور پیچیدگیوں کا سامنا کرنے کی نہ تو اہلیت ہے اور نہ خواہش۔ ان مسائل میں سائنس پر مبنی کلچر کو فروغ دینا یقیناً سب سے زیادہ اہم ہے۔

یہ کتاب مندرجہ بالا مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کوشش ہے۔ کتاب کا خاکہ مندرجہ ذیل ہے:

سائنس کی نوعیت اور مقصد کے متعلق حیرت انگیز طور پر ذہنی یا فکری انتشار پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ امر منطقی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے سائنس کی ٹھیک ٹھیک تعریف کرنے کی کوشش کی جائے۔ طریق کار کا تعین کیا جائے۔ دوسرے باب میں سائنس اور عیسائی دینیات (کرپشن تھیولوجی) کے درمیان تنازعے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ازمہ وسطی کے کچھ تنازعات بیسیوں صدی میں بھی برقرار ہیں اور غالباً اکیسویں صدی میں بھی باقی رہیں گے۔

مندرجہ بالا ابتدائی ابواب کے بعد میں نے مسلم ممالک میں سائنس کے موجودہ حالات کا جائزہ لیا ہے۔ میرے لئے یہ ایک ناخوشگوار فرض تھا کیونکہ اسلامی دنیا میں سائنس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر وسائل اور ملتے جلتے تاریخی و ثقافتی سیاق و سباق رکھنے والے غیر مسلم ملکوں کا مقابلہ مسلم ممالک کے ساتھ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سائنس کے شعبے میں مسلمانوں کی کارکردگی مایوس کن ہے۔ یہ سائنسی پسماندگی اس بڑے بحران کا ایک جزو ہے جو مسلم ممالک کی حکومتوں کی ہمہ گیر ناکامیوں سے پیدا ہوا ہے۔ یہ حکومتیں قومی اقتدار اعلیٰ اور قومی وسائل کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ یہ عوام کی بنیادی ضروریات مہیا نہیں کر سکتیں اور عوامی نمائندہ حکومتوں کا قیام بھی ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان ناکامیوں کے مسلمان عوام پر مختلف اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ ایک رد عمل یہ ہے کہ زمانہ حال سے منہ موڑ لو اور محفوظ ماضی میں پناہ لے لو۔ دوسرا رویہ یہ ہے کہ جدیدیت کے بعض عناصر کو اسلامی عقائد اور رسم و رواج میں شامل کر لو اور تیسرا رویہ یہ ہے کہ خالص ”مغربیت“ اختیار کر لو۔ ان رویوں کا تاریخی مطالعہ اور سائنس کے لئے ان کی اہمیت یا ان کے اثرات و نتائج کی بحث پانچویں باب میں کی گئی ہے۔

بعض مسلم ممالک میں مذہبی کٹرپن اور جدید سائنس کی اصلاحات اور لوازمات کا عجیب و غریب ملغوبہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ”وہ اسے اسلامی سائنس کہتے ہیں“۔ اس عنوان سے ایک باب میں اس نام نہاد سائنس پر تنقید کی گئی ہے جس کا رواج پاکستان میں جنرل ضیاء کے دور حکومت میں ہوا اور یہ بعض دیگر مسلم ممالک میں بھی مقبول ہے۔ یہ باب جب مضمون کے طور

پر ایک ماہنامہ میں شائع ہوا تو اسے نام نہاد جدید ”اسلامی سائنس“ کے پرچار یوں اور حمایتیوں نے کڑی تنقید اور دشنام طرازی کا نشانہ بنایا۔ اس کی اشاعت کے بعد تقریباً ایک سال تک گرم گرم بحث جاری رہی۔ مضمون کے نقطہ نظر کی حمایت کرنے والوں نے اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا کہ اسلامی ملکوں کے حکمران اسلام کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ جب ضیاء حکومت کے اسلامی کردار کو غلط ثابت کرنے کے لئے عدالت سے رجوع کیا گیا تو اس مضمون کو عدالتی ریکارڈ میں شامل کیا گیا۔ کتاب کا باب اصل مضمون سے زیادہ تفصیلی ہے۔

”اسلامی سائنس“ کے متعلق دیگر نظریات (جن کی اشاعت و کالت مورلیس بوکائل حسین نصر اور ضیاء الدین سردار کرتے ہیں) پر تبصرہ بعد کے باب میں کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ آیا نظریاتی یا قومی سائنس کا وجود ممکن ہے۔ دلیلوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ایسی کوئی سائنس نہیں ہو سکتی ہے۔

اسلامی تمدن کا ماضی سے اٹوٹ رشتہ ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت میں سائنس کے آغاز اور پانچ صدیوں تک اس کے پھلنے پھولنے کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش میں سب سے پہلے چند اہم اور مشکل سوالات سامنے آتے ہیں: کیا مسلمانوں کی سائنس خاص طور پر اسلامی نوعیت کی تھی؟ یہ کس حد تک عوامی ثقافت میں رچ بس گئی تھی؟ پھر وہ کیا سماجی عوامل و محرکات تھے جنہوں نے اسے پروان چڑھایا؟ اس کے خلاف مذہبی مخالفت کس حد تک پائی جاتی تھی اور اس مخالفت کی نوعیت کیا تھی؟ گوان سوالات کے لئے کتاب کے تین ابواب مختص کیے گئے ہیں؛ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ دراصل یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر ایک درجن کے قریب پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے لکھے جاسکتے ہیں۔

سائنسی انقلاب یورپ میں ہی کیوں آیا؟ دنیائے اسلام میں کیوں نہیں آیا؟ ان دلچسپ مگر مشکل سوالات پر دسویں باب میں بحث کی گئی ہے۔ ان سوالات کے جوابات غیر تسلی بخش ہو سکتے ہیں؛ کیونکہ کوئی ایسی کسوٹی موجود نہیں جس پر پرکھ کر ان کو صحیح یا غلط قرار دیا جاسکے۔ تاہم ان سوالوں کے جواب دینے کی کوشش میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے، وہ میرے خیال میں دلچسپ اور مفید ہیں۔ ان اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے جو قرین عقل ہیں اور جن کے شواہد

تاریخ سے بھی ملتے ہیں۔ یہ کوشش ایسے موضوعات یا مضامین کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کراتی ہے جو فلسفہ، قانون، اقتصادیات اور سیاسیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات قابل افسوس سہی لیکن بے موقع نہیں ہے کہ بعض عوامل جو ماضی میں مسلمان معاشروں میں سائنسی ارتقا کے لئے رکاوٹ ثابت ہوئے تھے موجودہ زمانے میں بھی کارفرما ہیں۔

مسلم ممالک میں سائنس کی مایوس کن حالت اور مستقبل قریب میں بہتری کے آثار نہ ہونے کا خیال ہی نہایت تکلیف دہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض قاری حقیقت حال کے اظہار سے ناخوش ہوں۔ لیکن کتاب کا مقصد حقیقت سے روشناس کرانا ہے نہ کہ قاری کو خوش کرنا۔ حقیقت سے واقفیت کے بغیر تعمیری تبدیلی ناممکن ہے۔ امت مسلمہ جو نوع انسان کا پانچواں حصہ ہے اس وقت تک قعر مذلت میں رہے گی جب تک سائنس اور معاشرتی مسائل کو عقلی نقطہ نگاہ سے دیکھنے اور حل کرنے کو اسلامی افکار سے متصادم سمجھا جائے گا لیکن امید رکھنی چاہیے کہ اسلامی ملکوں میں سائنس کا مستقبل روشن ہوگا کیونکہ ایسے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو سائنسی ترقی کے لئے دقیانوسی رویوں میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں۔

اس کتاب کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ دین اسلام کی سچائی کا تعین مسلم ممالک کی سائنسی پسماندگی سے کیا جائے۔ اس قسم کی دلیل مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں قطعی طور پر غیر معقول ہوگی۔

اولاً مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت اس دعوے پر متفق ہے کہ موجودہ دور میں سچے اور صحیح اسلام پر دنیا میں کہیں بھی عمل نہیں کیا جا رہا ہے اس لئے موجودہ حقائق اور خالص اسلامی تصورات کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ ثانیاً دین کی کچھ ایسی تفسیریں موجود ہیں جو دنیاوی اور دینی معاملات کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی اجازت دیتی ہیں چنانچہ مذہب اور سائنس کے درمیان تضاد ضروری نہیں ہے۔ ثالثاً کسی مذہب کے پیروکاروں کی مادی خوش حالی یا کامیابی اس مذہب کی اچھائی یا سچائی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

آخری نکتہ بہت اہم ہے۔ جب چھٹی صدی عیسوی میں گوتم بدھ کا مذہب جاپان پہنچا تو وہاں کی حکومت کو اس مذہب کی سچائی پر شبہ تھا۔ چنانچہ بادشاہ کے ایک درباری کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ تجربہ کی غرض سے نیا مذہب اختیار کر لے۔ اگر یہ مذہب اختیار کرنے کے بعد وہ معاشی اعتبار

سے دوسروں سے زیادہ خوش حال ہوا تو سارے جاپانی نیا مذہب اپنالیں گے ورنہ یہ مذہب جہاں سے آیا تھا وہاں لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن دنیاوی امور میں کامیابی کی یہ سادہ اور آسان کسوٹی مذہب کی سچائی پر کھنے کے لئے عام طور پر قبول نہیں کی گئی۔ مثال کے طور پر دنیاوی و مادی امور میں کامیابی کی مثالوں کے پیش نظر یہودیوں کا مذہب ماننے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونی چاہیے تھی، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لئے ہم دین اسلام کی صداقت کے لئے اس کے ماننے والوں کی دنیاوی کامیابیوں یا ناکامیوں کو معیار نہیں بنا سکتے۔

MashhalBooks.org

سائنس کیا ہے اور کیسے شروع ہوئی؟

یہ نظریہ ابھی تک عام نہیں کہ فطرت ضابطوں کی پابند ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ پسماندہ اقوام ایک غیر یقینی دنیا میں رہتی ہیں۔ اب بھی لوگ بارش کے لئے اجتماعی دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن شاید وہ یہ دعا مانگنے میں پس و پیش کریں گے کہ سورج ایک مقام پر ساکت کھڑا ہو جائے۔ یہ شاید اس وجہ سے ہے کہ موسمیات کی بہ نسبت فلکیات زیادہ ترقی یافتہ سائنس ہے: جے۔ ڈبلیو۔ این سکی ون۔

پاکستان میں ایک عام طالب علم سائنس کو نہایت خشک اور غیر دلچسپ مضمون سمجھتا ہے جس کا مطالعہ کسی سزا سے کم نہیں۔ ہماری درس گاہوں میں بڑی محنت و مشقت کے ساتھ فارمولے اور ڈائیاگرام دماغ میں ٹھونسے جاتے ہیں؛ لیکن جس طرح چھید والے برتن میں پانی ٹھہرتا نہیں اسی طرح یہ تمام رٹی رٹائی باتیں دماغ سے نکل جاتی ہیں۔ گویا کہ سائنس کو بے فائدہ اور بے مقصد سمجھا جاتا ہے۔ دراصل یہ ہمارے دقیانوسی اور غلط طریقہ تعلیم کا ثمر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنس ایک نہایت دلچسپ اور فائدہ بخش مضمون ہے۔ آج ہماری روزمرہ زندگی کا دارومدار مکمل طور پر سائنس پر ہے اور یہ سائنس ہی ہے جس کی وجہ سے جدید زمانہ ہمارے آباؤ اجداد کے زمانے سے یکسر مختلف ہے اور بہتر بھی۔ بہتر کس لحاظ سے؟ تین سو سال پہلے یورپ میں سائنسی انقلاب برپا ہوا تھا۔ اس وقت ایک آدمی کی زندگی کی متوقع میعاد 40 سال سے بھی کم تھی۔ آج یورپ میں یہ میعاد 75 برس سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔ بے ہوشی کی دواؤں (انسٹیزیا) کی ایجاد سے قبل زخمی تکلیف کے مارے جاں بحق ہو جاتے تھے لیکن آج

فن جراحت اتنی ترقی پا چکی ہے کہ جسم کے خراب اعضاء نکال کر ان کی جگہ دوسرے لگائے جاسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ دل، گردے، جگر، آنکھیں وغیرہ ایک جسم سے دوسرے میں منتقل کئے جاسکتے ہیں۔ طبی سائنس نے ہمارے لئے کیا کچھ کیا ہے اس کا اندازہ آپ کو اس وقت ہوتا ہے جب آپ کی اپنی یا کسی عزیز کی جان خطرے میں ہوتی ہے۔

سائنس نے اونٹوں اور گھوڑوں کا زمانہ ختم کر دیا اور اب انسان خلا کی وسعتوں اور سمندر کی گہرائیوں میں بھی بہ آسانی سفر کرتا ہے۔ دور دراز کے علاقوں کی خبریں جو پہلے مہینوں، سالوں میں پہنچتی تھیں اب پلک جھپکتے ہی مل جاتی ہیں۔

اگرچہ سائنس کے یہ کمالات شاندار ہیں لیکن اس کا اصل کمال کچھ اور ہے۔ درحقیقت سائنس نے انسان کا شعور بیدار کیا اور اسے یہ احساس دلایا کہ وہ فطرت کی قوتوں کو قابو کر سکتا ہے۔ قدیم زمانوں میں انسان قدرتی طاقتوں کا ایک بے اختیار غلام ہوتا تھا۔ ان کے سامنے وہ ایک ہلکے پھلکے تنکے کی مانند تھا۔ جسے ہوا کا جھونکا کبھی ادھر لے جائے یا ادھر، بجلی کڑکتی، وہ خوف سے کانپتا اور بارش نہ ہوتی تو وہ دیوتاؤں سے التجا کرتا، سیلاب، زلزلے، وبائیں، بیماریاں، یہ تمام آفتیں ان دیوتاؤں اور خداؤں کی ناراضگی کی نشانیاں سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان آفتوں سے بچنے کے لئے ہزار ہا قسم کے طلسمات اور توہمات وجود رکھتے تھے۔ لیکن جب سائنس نے یہ ثابت کیا کہ تمام قدرتی مظاہر کے پیچھے وجوہات خالصتاً مادی ہیں، تو ان عقائد کا سحر ٹوٹنے لگا اور مظاہر کو سمجھنے کے لئے ماورائی طاقتوں کی ضرورت ختم ہونے لگی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس کے سبب آج دنیا کو بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ آخر ماحول کی آلودگی اور نیوکلیائی ہتھیار اسی کی پیداوار ہی تو ہیں۔ چنانچہ اس نکتے پر بہت بحث ہوئی، آیا کہ یہ خرابیاں سائنس کے غلط استعمال کے باعث ہیں یا ان کا سبب سائنس کی فطرت میں ہی پوشیدہ ہے۔ اصل تنازعہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب سائنس کے مخالفین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنسی علم کی ماہیت اور تحقیق کا طریقہ کار بنیادی طور پر ناقص ہے اور ان سے فقط بگاڑ ہی پیدا ہوگا۔ اس لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ انسانی روح کو محسوس کرنے والے نظریہ سائنس کو زنجیروں سے نجات دلا کر ایسا نعم البدل تلاش کیا جائے جس کے بارے میں ہنوز سوچا نہیں گیا۔ لیکن نعم البدل پر بحث کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ سائنس کی حقیقت کیا ہے۔

سائنس کیا ہے؟

اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جدید سائنسی غور و فکر کی تہہ میں کارفرما مندرجہ ذیل تصورات اور اصطلاحات کے مطلب سمجھ لئے جائیں۔

حقائق (Facts)

سائنس کا آغاز اس مفروضے سے ہوتا ہے کہ معروضی حقائق کا وجود ہے۔ مثال کے طور پر ایک سائنس دان اپنے حواسِ خمسہ (ناک، کان، زبان، آنکھ وغیرہ) آلات اور پیماؤں (مثلاً تھرمامیٹر یا حرارت پیمائے) سے حاصل کردہ معلومات کو بطور حقائق تسلیم کرتا ہے۔ یہ حقائق صحیح مانے جاتے ہیں؛ بشرطیکہ دوسرے مشاہدہ کرنے والے بھی ان کی صحت سے اتفاق کریں یا مختلف اوقات اور مقامات پر بار بار مشاہدہ کرنے کے بعد ایک جیسے نتائج برآمد ہوں۔ اس طریق کار کی بدولت افراد کے ذاتی عقائد و آراء سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مثال کے طور پر اگر طاقتور دور بینوں کے ذریعہ مشاہدہ کرنے والوں کی ایک تعداد مشتری سیارے کے چاندوں کی اشکال، جسامت اور دائرے میں حرکت کرنے پر اتفاق رائے کرے تو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کے مشاہدات صحیح حقائق ہیں۔ یہ بات موضوع سے خارج ہے کہ ان مشاہدہ کرنے والوں میں سے کچھ یا سبھی برے کردار کے حامل ہیں۔ شرابی ہیں یا اپنی بیویوں کو مارتے ہیں۔ البتہ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کہیں انہوں نے باہمی گٹھ جوڑ تو نہیں کیا ہے، نیز یہ کہ وہ اپنے طور پر اور ایک دوسرے سے علیحدہ مشاہدہ کر کے یکساں نتائج پر پہنچے ہیں۔ اس کے برعکس ہم ایک پارسا اور پرہیزگار شخص کی باتوں کو سائنسی حقائق نہیں مان سکتے کیونکہ یہ مندرجہ بالا طریق کار پر پورا نہیں اترتے۔

قوانین (Laws)

سائنسی قوانین مشاہدات پر مبنی ہیں۔ یہ مشاہدات طبعی خاصیتوں کے ہوتے ہیں مثلاً وزن، فاصلہ، وقت، درجہ حرارت، تعداد وغیرہ۔ ایک سائنسی قانون ان جیسے خواص کے مابین ایک رشتہ

وضع کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:

1- چارلس کے قانون کے مطابق اگر کسی گیس کو گرم کیا جائے تو اس کا حجم بڑھ جاتا ہے بشرطیکہ اس کا دباؤ مستقل رکھا جائے۔

2- مینڈل کے قانون کے مطابق والدین سے اولاد کو جو خصوصیات ملتی ہیں وہ ایسے ہی والدین میں موجود ہوتی ہیں اور ان خصوصیات کا انحصار ان وحدتوں کے سنگم پر ہوتا ہے کہ جن کے ذریعے یہ خصوصیات منتقل ہوتی ہیں۔

مفروضات (Hypothesis)

ہر سائنسی تحقیق کا آغاز کسی مفروضے سے ہوتا ہے اس سے آگے کا قدم مشاہدے یا تجربے کی کسوٹی پر مفروضے کو پرکھنا ہوتا ہے۔
دو عدد مفروضے مندرجہ ذیل ہیں:

”پھیپھڑوں کے سرطان کا امکان اسی تناسب سے بڑھ جاتا ہے جس تناسب سے روزانہ پی جانے والی سگریٹوں کی تعداد بڑھتی ہے۔“
”اگر زیادہ لوگ بارش کی دعائیں مانگیں تو بارش کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔“

مندرجہ بالا مفروضات میں سے ہر ایک کو ثابت کرنے کے لئے کافی تعداد میں حقائق مہیا کرنے چاہئیں تاکہ کسی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مذکورہ بالا دونوں مفروضوں سے عجیب و غریب نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں، مثلاً یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ زیادہ سگریٹیں پینے سے عمر بڑھتی ہے یا زیادہ لوگ بارش کی دعائیں مانگیں تو کم بارش ہوتی ہے۔

نظریہ (Theory)

نظریہ دراصل عظیم تصوراتی اسکیم کا نام ہے جو سوچ کا محور ہوتا ہے اور اپنے دائرہ کار میں ایک مکمل تصویر فراہم کرتا ہے لیکن ایک سائنسی نظریے کو اس کے علاوہ بھی بعض معیاروں پر پورا اترنا چاہیے مثلاً

☆ اسے تمام معلوم تجرباتی یا مشاہداتی حقائق کے مطابق ہونا چاہیے۔

☆ اسے کوئی نئی بات ثابت کرنی چاہیے، یعنی ایسے حقائق کی پیش گوئی کرنی چاہیے جو تاحال نامعلوم تھے اور جن کو جانچ پرکھ کر ثابت کیا جاتا ہے۔

☆ بقول کال پوپر یہ صحیح یا غلط ثابت کرنے کے قابل ہو۔ یعنی یہ ایسی صورت حال کے تعین کا اہل ہو جس میں اس سوال کا درست جواب دیا جاسکے کہ آیا یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط۔
نظریہ محض ایک مفروضہ نہیں ہوتا جس میں صرف چند مشاہدات کی توجیہ کرنے کی صلاحیت ہو بلکہ ایک ایسا فکری نظام ہے جو اپنے دائرہ کار میں ہمہ گیر ہوتا ہے۔ ایک کامیاب نظریے کی امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مظاہر قدرت کے بہت وسیع حلقے پر حاوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نیوٹن کا نظریہ کشش سورج کے گرد زمین کی حرکت اور دیگر ستاروں سے سورج کے تعلق پر یکساں منطبق ہوتا ہے۔ اس ہمہ گیریت کے باعث یہ ضروری نہیں کہ ہر نئی حقیقت کے سامنے آنے پر کوئی نیا نظریہ بنانا پڑے۔

استنباط و استقراء (Deduction and Induction)

حقائق کی مسلسل یکسانیت کے پیش نظر استقرائی طریقے (Induction) سے معلومات جمع کر کے سادہ کلیہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہر روز سورج کو مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوتے دیکھ کر ہم استقرائی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آئندہ کل بھی سورج کا یہی عمل ہوگا۔ استنباطی طریقے (Deduction) اس سے مختلف ہے۔ اس میں ہم کچھ عام کلیوں یا مقدمات کو لے کر منطقی دلائل کے ذریعہ مخصوص نتائج اخذ کرتے ہیں۔

سائنسی طریقہ (The Scientific Method)

مندرجہ بالا تصورات کی تعریف کے بعد اب یہ دیکھا جائے کہ سائنسی طریقہ کار کیا ہے۔ دراصل یہ طریقہ کار مندرجہ ذیل مراحل پر مشتمل ہے:

☆ مسئلہ کی نشاندہی: یہ مسئلہ کوئی ایسی چیز ہو سکتا ہے جو اپنی فطرت، ساخت، اثرات، دوسری چیزوں سے باہمی رد عمل وغیرہ کے اعتبار سے نامعلوم ہو۔ یا یہ اشیاء واقعات یا علامات وغیرہ کے درمیان ایک یا ایک سے زیادہ غیر واضح یا مبہم رشتے ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایسا ہو جس کی توجیہ مروجہ قوانین یا نظریات نہ کر سکتے ہوں۔

☆ اس مرحلہ پر وہ معلومات اور تحریریں جو اس مسئلہ سے متعلق ہوں جمع کی جائیں اور ان کی روشنی میں اس بات کا تعین کیا جائے کہ آیا اسے اب تک حاصل کردہ علم کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

☆ یہ سائنسی مسئلہ کسی نئی چیز کی نشاندہی کر رہا ہے جو بظاہر ناقابل فہم ہے تو ایسے مشاہدات یا تجربات ترتیب دیئے جائیں جن کے ذریعے نئے اور بامعنی نشانات مل سکیں۔

☆ جب کافی نشانات ملنے کے بعد ان کی بنیاد پر چند منطقی مفروضے بنا لئے جائیں تو وہ مفروضہ منتخب کیا جائے جو سب سے زیادہ سادہ، جمالیاتی اور مطمئن کرنے والا ہو۔

☆ منتخب کردہ مفروضے سے مختلف نتائج اخذ کئے جائیں اور اس کی صحت کو پرکھنے کے لئے مشاہدات یا تجربات ترتیب دیئے جائیں۔

☆ حقائق جاننے کے بعد بھی اگر ایک یا ایک سے زیادہ باتیں وضاحت طلب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ منتخب کردہ مفروضہ مشکوک ہے اور دوسرے مفروضوں کو آزمانے کی ضرورت ہے۔

☆ اگر مفروضہ ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور کوئی بات وضاحت طلب نہیں ہے تو ایسے مفروضہ کو ”قانون“ کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

☆ یہ قانون اس وقت تک صحیح مانا جائے گا جب تک کہ اس کی مدد سے کچھ نئے مشاہدات یا تجربات کی وضاحت مطلوب نہ ہو۔ ایسی صورت میں یہ قانون کا درجہ برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ نئے مفروضے تلاش کرنے ہوں گے اور ان مفروضوں کو پرکھنے کے لئے دوبارہ اسی طریق کار کا اعادہ کرنا ہوگا۔

ہو سکتا ہے کہ منطقی طور پر متوازن طریقوں سے حقیقی سائنسی ترقی نہ ہو۔ کبھی کبھی اتفاق اور تخلیقی صلاحیت کے عناصر سیدھے سادے مروجہ طریقوں کو بیکار کر دیتے ہیں لیکن کسی نظریے تک پہنچنے کے طریق کار سے قطع نظر حقیقت یا سچائی کے اثبات کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ آیا یہ نظریہ تجربے اور مشاہدے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ نظریے کی افادیت اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ وہ کتنے معلوم حقائق کی تشریح کرتا ہے، نیز کتنی نئی باتیں ہم کو بتاتا ہے۔

سائنس ایک ایسی عمارت کی طرح ہے جو ہمیشہ زیر استعمال اور زیر مرمت رہتی ہے، مسلسل بلند ہوتی رہتی ہے، اس میں نئی وسعتوں اور جدید شعبوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اپنے اصولوں کی بنیاد پر اپنا احتساب اور تنقید خود کرتی ہے۔ اگرچہ سائنس ابتدا میں ایک سادہ چیز تھی مگر اب یہ

ایک پیچیدہ نظام بن گیا ہے۔ انفرادی حیثیت میں ایک سائنس دان ایک چوٹی کی طرح محض ایک معمولی کارندہ ہوتا ہے جو انسانی علم کے وسیع خزانے کو بھرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ جمع شدہ علمی خزانے سے استفادہ کر کے اس میں اپنے حصے کا اضافہ کرتا ہے۔ جلد ہی اس کا انفرادی حصہ وسیع خزانے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ بڑے سائنس دانوں کے کارنامے (ان کی دریافتیں اور ایجادیں) موجودہ سائنس میں اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ طالب علم کو اصلی کتابوں یا ماخذ کے مطالعے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مثلاً گریجویٹ سطح پر طبیعیات کا طالب علم اپنے علم و فہم کو خطرے میں ڈال کر ہی مناظریات (روشنی کی سائنس) کا مطالعہ ابن الہشیم کی کتاب ”المناظر“ سے اور میکانیات کا مطالعہ نیوٹن کی ”پرنسپیا“ (Principia) سے کرے گا۔ اس کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ ایسی جدید کتاب کا مطالعہ کرے جس میں ہزاروں سائنس دانوں کی مجموعی تحقیقات شامل ہوں جنہوں نے زیر مطالعہ شعبے یا موضوع کو ترقی دینے، وسیع کرنے اور عام و سادہ بنانے کے لیے کام کیا ہے۔

سائنس کی ارتقا پذیر اور لامتناہی فطرت اسے دیگر انسانی افکار اور علوم سے ممتاز کرتی ہے۔ مذہب ابدی اور غیر متغیر صدائوں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان صدائوں میں آئندہ نسلیں نہ تو کوئی اضافہ کرتی ہیں اور نہ ہی ان کو مسترد کرتی ہیں۔ مذہبی نقطہ نظر کے مطابق علم کو سادگی و جامد تصور کیا جاتا ہے، جس میں کوئی کمی و بیشی کی گنجائش نہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ بنیادی طور پر سائنس اور مذہب ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتے۔ بلکہ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ سائنس اور مذہب دو ایسے علیحدہ شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو آپس میں گڈمڈ نہیں کیا جاسکتا۔

سائنسی اور غیر سائنسی نظریات میں فرق

سائنسی اور غیر سائنسی سوچ میں فرق واضح کرنے کے لئے وینڈل جانسن نے ایک دلچسپ حکایت لکھی:

”کسی زمانے کی بات ہے کہ ایک ملک میں دو پراسرار معے تھے جن کا بھید ملک کے بڑے بڑے دانشور سالہا سال سرکھپانے کے باوجود نہیں پاسکے تھے۔۔۔۔۔ جب کبھی کوئی سکے کی پینل تلاش کرتا تھا تو اسے نہیں ملتی تھی اور جب بھی کوئی سکے کی پینل تراشنا چاہتا تو پینل تراش

ہمیشہ ریزوں سے بھرا ہوا پایا جاتا تھا۔ یہ بہت پریشان کن صورت حال تھی۔ اس کے خلاف عوامی مظاہروں کے بعد دقیق تحقیقات اور ہنگامہ خیز صورت حال کے اسباب کی وضاحت کے لئے حکومت نے ممتاز فلسفیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے نہایت مشکل حالات میں تحقیقات کر کے کچھ نتائج اخذ کئے۔ لوگ پریشان تھے اور کمیٹی کے غور و فکر سے حاصل کردہ نتائج اور سفارشات کو جلد از جلد جاننا چاہتے تھے۔ آخر کار کافی وقت گزرنے کے بعد کمیٹی کے ارکان ہر دوسرے رازوں کی وضاحت کے لئے سربراہ مملکت کے سامنے پیش ہوئے۔ بات بالکل سادہ تھی۔ کمیٹی کے پیش کردہ نظریے کے مطابق زمین کے اندر چھوٹے چھوٹے بونوں کی بڑی تعداد رہتی ہے۔ یہ بونے بالشتیئے (چھوٹے) کہلاتے ہیں۔ رات کو جب سب لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں یہ گھروں میں آتے ہیں۔ وہ ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں اور ساری سکے دار پنسلیں جمع کر کے انہیں پنسل تراش سے ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں اور پھر زمین کے اندر واپس چلے جاتے ہیں۔ یہ وضاحت سن کر قومی اضطراب اور بے اطمینانی کی کیفیت ختم ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نہایت ہی دانش مندانہ نظریہ تھا۔ بیک جنبش قلم اس نے دونوں معموں کو حل کر دیا تھا۔“

سوال یہ ہے کہ بالشتیوں کا یہ نظریہ سائنسی کیوں نہیں؟ اس کا سادہ اور واضح جواب یہ ہے کہ یہ نظریہ حقائق کے ایک تنگ چوکھے میں فٹ ہونے کے لئے وضع کیا گیا تھا اور یہ کسی نئی بات کی پیش گوئی نہیں کرتا۔ بالشتیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نظر نہیں آتے۔ وہ رات کو اس وقت آتے ہیں جب کوئی ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ بالشتیوں کی دیگر عادتوں کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ اس لئے ہم نہیں جانتے کہ ان سے اور کس کام یا واردات کی توقع کرنی چاہیے۔ لیکن کیا ہم بالشتیوں کے متعلق نظریے کو غلط یا باطل ثابت کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہے کہ اس کو ہم غلط ثابت نہیں کر سکتے۔

اس نظریے کو جھوٹا یا سچا ثابت کرنے کے لئے کوئی کسوٹی نہیں ہے۔ لوگ بالشتیوں کے وجود کو بطور عقیدہ مان سکتے ہیں کیونکہ اس عقیدے کو جھٹلانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اس لیے کال پوپر کے وضع کردہ معیار کے مطابق یہ نظریہ سائنسی نہیں ہو سکتا۔

جائیں۔ اس مرکزی خیال کی تشریح بعد میں میکاکی سائنس کے ذریعہ کی گئی۔ تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی، حالانکہ سائنس کے ہر شعبے میں بے پناہ ترقی ہوئی ہے، لیکن بیسویں صدی کی سائنس اب بھی کارٹیزی نظریے پر مبنی ہے۔ اس کے بغیر پینی سلین، ٹیلی ویشن اور بجلی کی ایجاد اور انسان کا چاند پر پہنچنا سبھی ناممکن ہوتا۔

کارٹیزی نظریے کے ساتھ حیوانی مشین کا تصور یعنی حیوان بھی مشین کی مانند ہوتے ہیں پیدا ہوا۔ ڈیکارٹ کے زمانے میں گھڑی خود کار مشین کا ایک اچھا نمونہ تھی۔ چنانچہ ڈیکارٹ حیوانی مشین کا تقابل گھڑی سے کرتا ہے۔ اس نے کہا کہ حیوان گھڑی کی طرح ہے جو پہیوں اور کمائیوں پر مشتمل ہے۔ بعد میں وہ اس تقابل میں انسانی جسم کو بھی شامل کر لیتا ہے۔

”میں انسانی جسم کو ایک مشین کی طرح سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں جیسے ایک بیمار آدمی ایک ناقص گھڑی کی طرح ہے، اسی طرح تندرست آدمی ایک اچھی گھڑی کی مانند ہے۔“

ڈیکارٹ کے بقول تمام حیات دراصل کیمیا ہے اور تمام کیمیا آخر کار طبیعیات ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں سالماتی حیاتیات اور نسلی انجینئرنگ (Genetic Engineering) کارٹیزی نظریے کا اظہار بن گئے ہیں۔

غالباً کارٹیزی کا سب سے زیادہ انقلابی عنصر یہ تھا کہ تمام بیماریاں حیاتیاتی مشین کی خرابی کا اظہار ہوتی ہیں یا یہ نامیاتی جسم کی اس خرابی کا نتیجہ ہوتی ہیں جو مخصوص اسباب مثلاً گندگی، خراب غذا، جراثیم، کیڑے، کوڑوں وغیرہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دریافت عیسائی کلیسا کے پادریوں اور رہنماؤں کی توہماتی اور غیر سائنسی تعلیمات کے سراسر خلاف تھی۔ ہم اس مسئلہ پر آئندہ باب میں مزید روشنی ڈالیں گے۔

سائنسی انقلاب نے ازمنہ وسطی کے فرسودہ نظام کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور میں کلیسا کے اختیار کو نیست و نابود کر دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ بنیادی تبدیلی زیادہ تر جدید سائنس اور سائنسی طریق کار کے وہ بانی لائے جو خود پکے مذہبی تھے۔ ان میں سے چند مذہب کے دشمن بھی تھے۔ اٹھارہویں صدی میں فرانس کے مشہور ریاضی دان، لاپ لاس نے خدا کی فطرت کے بارے میں نیولین کو یہ جواب دیا تھا: ”ہمیں اس مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ لیکن ڈیکارٹ، گلیلیو اور نیوٹن کے نزدیک خدا کا وجود ایسے فلسفہ کے لئے ضروری تھا جو

ذہن اور مادہ دونوں کو تسلیم کرتا ہو۔ دراصل کائنات کا یہ تصور کہ وہ ایک خود کار عظیم نظام ہے خالق کے بغیر نامکمل رہتا ہے۔ لیکن یہ خالق عیسائی مذہب کا خدا نہیں تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کے مداخلتی خدا کے برعکس؛ میکائیلی کائنات میں خدا کا رول یہ ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں لا کر اسے ابدی قوانین کا پابند بنا دیتا ہے اور اس کے بعد یہ قوانین ہی کائنات کی تقدیر کا تعین کرتے ہیں۔ بقول والٹیر ”خدا نے کائنات کو اسی طرح پیدا کیا جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جوڑ کر گھڑی بناتا ہے۔ بنانے کے بعد خدا کائنات سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ طبیعیات کے قوانین کائنات کو اس طریقے سے چلاتے رہتے ہیں؛ جو مقدس منصوبے میں متعین کیا گیا ہے۔“

عقلیت پسند حکماء، مستقل مزاجی اور یقین کامل کے ساتھ خدا کی ارادتا مداخلت کے منکر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے معجزات کے وقوع پذیر ہونے سے بھی انکار کیا ہے۔ یہ پرانا تنازعہ ہی کائنات کے متعلق سائنسی زاویہ نگاہ اور روایتی نقطہ نظر کے درمیان مخالفت کا سبب ہے۔ کچھ فلسفیوں نے اس تنازعہ کی شدت کو کم کرنے کی غرض سے معجزے کی تعریف میں تبدیلی پیدا کی ہے۔ وہ معجزے کو کوئی حیرت انگیز چیز قرار دیتے ہیں۔ ان معنوں میں تو ہر چیز معجزہ ہے۔ اپنے مدار پر ہر سیارے کی ٹھیک ٹھیک گردش؛ کائنات کی وسعت؛ زمین کا نزاکت کے ساتھ متوازن ماحولیاتی نظام اور انسانی دماغ کی بے پناہ پیچیدگی۔۔۔۔۔۔ یہ سب مستقل معجزات ہی تو ہیں اور غالباً سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ کائنات میں ہر شے چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے ستاروں تک بلکہ بجائے خود کائنات تک بلا استثنا ایک ہی طرح کے ابدی اور بے لچک طبیعیات قوانین کے پابند ہیں۔ سائنس کے پاس ان قوانین کی کوئی توضیح یا توجیہ نہیں ہے اور وہ اس دعوے کی تردید نہیں کر سکتی کہ کائنات کو ایک مقدس خالق نے پیدا کیا ہے۔

اس سائنسی نظریے کا مقابلہ ”معجزہ“ کی اصطلاح کے روایتی استعمال سے کیجئے۔ روایتی طور پر معجزے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی چیز ابدی اور لازمی طبیعیاتی قوانین کے خلاف یا ان کے عارضی تعطل سے واقع ہو جائے۔ بقول والٹیر؛ اگر چودھویں چاند کی رات کو سورج گرہن ہو؛ اگر مردہ آدمی اپنے سر کو بغل میں دبا کر دو میل چلے؛ تو ہم اسے معجزہ کہیں گے۔ معجزات کی توضیح

میں والٹیر نے واضح رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ خدا نے جو قانون رائج کیا ہے وہ خود اسے معطل نہیں کر سکتا۔ ”کیا یہ تصور کرنا نہایت بے ہودہ حماقت نہیں ہے کہ اس مٹی کے چھوٹے سے توڑے کی تین یا چار سوچیوٹیوں کے لئے وہ لامحدود ہستی اس عظیم انجن کی چرخوں کو الٹا گھمانا شروع کر دے جو ساری کائنات کو حرکت میں رکھے ہوئے ہے۔“

جدید سائنس کا نقطہ نظر معجزات کے بارے میں وہی ہے جو والٹیر کا تھا۔ یہ یقیناً ایک سچے اور سنجیدہ عالم طبیعیات کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق و تدوین کرنے والے خدا پر ایمان لائے لیکن یہ ایسے خدا کے تصور کی اجازت نہیں دیتی جو خواہ مخواہ یا کسی اصول کے بغیر مداخلت کر کے کسی سیارے کا مدار بدل دے، گرہن کو ملتوی کر دے، طبعی قاعدوں کے خلاف موسموں کو تبدیل کر دے یا کائناتی کھیل کے قواعد میں تغیر پیدا کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ وہ اپنی من مانی کی قوت رکھتا ہے۔ مداخلت کرنے والا دیوتا سائنس دان کو ایسے منحصر سے دوچار کرتا ہے جسے وہ حل نہیں کر سکتا کیونکہ اس صورت میں سائنسی تحقیق ناممکن ہو جاتی ہے۔ اگر سائنس دان بظاہر ایک ناقابل توجیہ مظہر سے دوچار ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ فرض کیجئے کہ اسے ایک لاعلاج مرض مثلاً ایڈز یا سیارے کے مدار کی عجیب و غریب تبدیلی یا نہایت غیر متوقع ضمنی جوہری ذرے کی دریافت کا سامنا ہے۔ کیا اسے ایک خاص نقطے تک پہنچنے کے بعد طبعی اسباب کی تلاش بند کر دینی چاہیے اور اس توقع پر اکتفا یا یقین کر لینا چاہیے کہ یہ سب کچھ ایک مقدس ارادے کے تحت یا مشیت ایزدی کی وجہ سے ہوا ہے؟ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس بات کے مواقع بڑھ جائیں گے کہ آئندہ اس کا ہی کوئی ساتھی صحیح طبعی اسباب دریافت کر لے اور سرخرو ٹھہرے۔ سائنس نے انسان کو فطرت کی بے رحم قوتوں سے نجات دلائی اور اسے یقین اور اعتماد کے تحفے دیئے۔ یہی سائنسی انقلاب کا حاصل ہے۔ لیکن کیا یہ ہو سکتا ہے کہ حالیہ سائنسی ارتقا ہمیں بتائے کہ سائنس کا دیا ہوا یقین محض ایک فریب ہے؟

کیا کوانٹم فزکس (Quantum Physics) نے سائنس کو تباہ کر دیا ہے؟ حالیہ برسوں میں کچھ لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ سائنس کو اگر طبعی اعتبار سے نہیں تو فلسفیانہ اعتبار سے مردہ قرار دیا جائے اور کہا یہ جاتا ہے کہ موت کا سبب خودکشی ہے اور خودکشی کا آلہ یا ہتھیار

خود سائنس کی ایک ایجاد ہے جسے کوانٹم فزکس کہتے ہیں۔ اس دعوے کے حق میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ جدید سائنس عقل سلیم اور فطرت کے مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کے مفروضات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایک تجربہ میں ایک جیسے ابتدائی حالات ہمیشہ ایک جیسے نتائج پیدا کریں گے۔ نیز یہ کہ درحقیقت مشاہدہ کرنے والے کی کوئی اہمیت نہیں اور مادی دنیا کی اپنی ایک ٹھوس حقیقت ہے، لیکن مشاہدہ، قیاس استنباط (Deduction) اور نظریہ سازی کے طریق کار نے آخر کار کوانٹم فزکس کو جنم دیا۔ سائنس پر اعتراض کرنے والوں کے بقول سائنس کی یہ نئی شاخ کہتی ہے کہ عقل سلیم پر مزید اعتماد نہیں کرنا چاہیے اور یہ کہ اپنی بنیادی سطح پر فطرت بالکل وہ نہیں ہے جس کا مشاہدہ اور تجربہ ہم روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں۔ اس طرح یہ انکشافات حقیقت کے اس تصور کو ختم کر دیتے ہیں جو مادی سائنس کے ارتقا میں کارفرما تھا اور خصوصاً اس مفروضے کی نفی کرتے ہیں کہ کل اپنے انفرادی حصوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ وقت قریب آ گیا ہے جب جدید سائنس کے ڈوبتے ہوئے جہاز کو چھوڑنا ہوگا اور وہ نعم البدل تلاش کرنا ہوگا جو مشرقی یا دیگر فلسفوں نے فراہم کیا ہے اور ویدی (ہندو) سائنس تیسری دنیا کی سائنس یا اسلامی سائنس جیسی سائنسی وحدتیں تخلیق کرنی ہوں گی۔

لیکن جدید سائنس درحقیقت بستر مرگ پر نہیں ہے۔ افسوس کہ یہ سائنس کے دشمنوں کا محض ایک خواب ہے۔ یہ خواب ان لوگوں کے لئے تو باعث اطمینان ہے جو جدید سائنس کو تمام برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید سائنس ٹھٹھاتی شمع نہیں بلکہ اتنی زیادہ طاقتور وسعت پذیر اور دائرہ کار کے اعتبار سے محفوظ ہے جتنی کہ آج سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ کوانٹم فزکس کی بدولت ایٹم کو اس کی بے شمار تفصیلات کے ساتھ اتنی اچھی طرح سمجھا جاتا ہے کہ اب اس کی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اب تو ایسی مشینیں بنائی گئی ہیں جو ایٹم کے لاکھوں گنا چھوٹے ذروں کو دیکھ سکتی ہیں۔ دوسری طرف ہماری یہ معلومات بھی اب کافی غیر مشتبہ ہیں کہ کائنات کی ابتدا پندرہ ارب سال پہلے کس طرح ہوئی اور اس کے چند ثنائے بعد ہی کیا کلیدی واقعات رونما ہوئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کائناتی ارتقا کے تمام پہلوؤں کی تفہیم کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جوں جوں بصری ریڈیائی، ایکس شعاعی، کائناتی شعاعی مشاہدات کئے جا رہے ہیں، توں توں معلوم شدہ طبیعیاتی

اصولوں کی صحت پر اعتبار بڑھتا جا رہا ہے۔

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کوانٹم میکینکس نے کچھ ایسے پریشان کن جدید تصورات کو جنم دیا ہے جن میں سے بعض عقل سلیم کی بظاہر نفی معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں یہ سوال پوچھنا چاہیے کہ سائنسی علمیات کے سامنے اس نے جو چیلنج پیش کیا ہے، ان کی فطرت کیا ہے؟ اور کیا اس کا یہ تقاضا ہے کہ سائنسی تحقیق کے وہ طریقے، جو اب تک سائنس کی بنیاد رہے ہیں، فرسودہ ہو گئے ہیں اور ہمیں ان کو ترک کر دینا چاہیے؟

کوانٹم نظریے نے جو فلسفیانہ مسائل چھیڑے ہیں، وہ بہت اہم ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی بہت تیکنیکی اور مشکل بھی ہیں۔ یہاں انھیں بیان کرنے کی انتہائی مختصر کوشش، چاہے یہ غیر اطمینان بخش ہی کیوں نہ ہو، پیش خدمت ہے۔

کوانٹم فزکس نے بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جنم لیا۔ موجودہ دور میں اس طبیعیات کا جدید مادی سائنس پر غلبہ ہے۔ اس کا آغاز ایٹم اور تابکاری سے متعلق کئی ایسے حقائق کو واضح کرنے کی کوشش سے ہوا، جو تجربات کے دوران مشاہدے میں آئے۔ یہ ایسے حقائق تھے جن کی نیوٹن کی طبیعیات کے ذریعے تشریح کرنا غیر ممکن تھا۔ ان حقائق کی تشریح میں کامیابی کا لازمی نتیجہ مادی دنیا کے متعلق ہمارے تصور میں انقلابی تبدیلی کی شکل میں رونما ہوا۔ مثال کے طور پر کوانٹم فزکس کے مطابق ایٹمی جسامت ذروں یا لہروں کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ ان صورتوں میں سے کون سی صورت نظر آتی ہے، اس کا انحصار مشاہدے کے طریقے پر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہائزنبرگ (Heisenberg) کے مشہور ”اصول غیر یقینی“ کے مطابق کسی بھی ایسی چیز کی ٹھیک ٹھیک حالت اور رفتار کا تعین بیک وقت نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات کافی پریشان کن ہے۔ کوانٹم فزکس سے پہلے دنیا کو بالکل پیش گوئی سمجھا جاتا تھا۔ ماضی کے واقعات حال کا تعین کرتے تھے اور مستقبل کا تعین حال کرتا تھا۔ اس یقین کی نفی اتنی پریشان کن تھی کہ آئن سٹائن کو کہنا پڑا: ”خدا کائنات کے ساتھ پانسے کا کھیل نہیں کھیلتا“۔ اور اس نے کوانٹم میکینکس کی مخالفت کی۔ لیکن گو آئن سٹائن اپنے دور کا صف اول کا عالم طبیعیات تھا، اس مسئلہ پر اس کے معاصرین نے (بجا طور پر) اس کے اختلاف کی چنداں پروا نہیں کی۔ اس نے جبریت کے یقین کو بحال کرنے کے لئے ”مخفی متغیرہ“ کا جو نظریہ متبادل کے طور پر پیش کیا، اس کے

خلاف اتنی شہادتیں تھیں کہ اسے تسلیم کرنا محال تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوانٹم طبیعیات نے ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ حقیقت کے بارے میں ہمارا موجودہ تصور نہایت ہی سادہ ہے۔ مثال کے طور پر کوانٹم میکینک کے اس بنیادی اصول کی معنویت پر غور کیجئے کہ کسی ذرے کا مشاہدہ کرنے کے عمل سے ہی اس کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر محولہ نظام برقیہ (الیکٹران) یا ایٹم ہو تو یہ حقیقت بلاچون و چرا تسلیم کر لی جاتی ہے۔ مشاہدے کے اختتام پذیر ہونے تک برقیہ ممکن حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہو سکتا ہے۔ پیمائش کے بعد ہی حتمی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ درحقیقت وہ کس حالت میں تھا۔ لیکن برقیہ کا مشاہدہ کرنے کی کوشش میں ہم برقیہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ مختلف متبادل حالتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے اور اس طرح ہماری کوشش مشاہدہ اس کی حالت کو تبدیل کر دیتی ہے۔

اب ”برقیہ“ کی جگہ ”مادی کائنات“ کو رکھ کر دیکھئے یہاں ہمیں ایک مخصوص درپیش ہوتا ہے۔ آفرینش کے بعد کائنات کوانٹم حالتوں کا آمیزہ تھی۔ بے شمار امکانات میں سے صرف ایک شے ہی حقیقت پذیر ہو سکا۔ کیا یہ اس وجہ سے ہوا کہ مشاہدے کے عمل نے بعض امکانات کو حقیقت بننے پر مجبور کر دیا اور دیگر امکانات کو حقیقت کے زمرے سے خارج کر دیا؟ اگر یہ صحیح ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشاہدہ کس کے ذریعہ یا کس کا؟ نوٹیل انعام یافتہ عالم طبیعیات یوجین پی۔ ڈیگنر کے مطابق یہ سوال ناگزیر طور پر انسانی شعور کو کائنات کی موجودہ حالت کا تعین کرنے والے عامل کی حیثیت سے سامنے لاتا ہے۔ گو طبیعیات کی یہ تفسیر متنازعہ ہے تاہم اس سے وجود اور حقیقت کے مسائل پر موجودہ سوچ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والے قاری

"Is the moon there when nobody looks-reality and Quantum Theory"

کے عنوان سے شائع شدہ مختلف مضامین پڑھ سکتا ہے۔

انوکھی پرکشش، عجیب و غریب۔ یقیناً کوانٹم طبیعیات کائنات کے اس رخ کی طرف کھڑکی کھولتی ہے جو ہماری عام قوت مشاہدہ کی پہنچ سے باہر ہے۔ ان لوگوں کے لئے یہ پریشان کن اور ناقابل فہم ہے جو اس کی ریاضیات سے نامانوس ہیں اور اس کی صحیح تفسیر کے متعلق تنازعات

ان لوگوں کے کانوں کے لئے اچھی موسیقی ہیں جو سائنس سے ہی چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن ایسے تنازعات کے باوجود ہمیں سائنس کی رسی تھامے رکھنی چاہیے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے قدم مشترک تجربات کی زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ آج طبیعیات دانوں کی بڑی اکثریت کو انٹیم میکینکس اور روزمرہ کے طور پر اور کامل اعتماد کے ساتھ استعمال کر رہی ہے۔ لاکھوں تجربات و مشاہدات کئے گئے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس نے اس طبیعیات کو غلط ثابت کیا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تنازعات کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی نظریہ یا سائنس ختم ہونے والی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اختلافات سائنس کے عام اور صحت مند عمل کا حصہ ہوتے ہیں۔ اگر کبھی کو انٹیم میکینکس کی جگہ کوئی اور ایسی سائنس لے لے جو زیادہ صحیح ہو جس کی تشریح زیادہ ٹھیک ہو سکے اور جو کم اختلافات کی حامل ہو تو بھی مادی دنیا کے متعلق ہمارے موجودہ علم کی نفی نہیں ہوگی۔ ہمارے پاس اس کی تاریخی نظیریں موجود ہیں۔ آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت نے نیوٹن کی میکینکس کی نفی نہیں کی بلکہ اس کو وسعت دی اور اسے نفاست بخشی۔

سچ تو یہ ہے کہ تشریح کا مسئلہ حل شدہ مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مسائل کی تفہیم غلط ہوتی ہے اور ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً گوکہ کو انٹیم میکینکس کو جبریت کی نفی قرار دیا جاتا ہے، تاہم یہ ایٹم سے متعلق صرف چھوٹے پیمانے کے طریقہ ہائے کار کے لئے تو اہم ہے ورنہ بالکل غیر متعلق یا بے محل ہے۔ پھر یہ مسئلہ بھی کہ آیا زیر مطالعہ چیز مشاہدے کے عمل سے اثر پذیر ہوتی ہے کہ نہیں، محدود پیمانے پر جائز ہے۔ یہاں بھی کو انٹیم طبیعیات کی ”کو پین ہاگن“ تشریح کام آ سکتی ہے۔ اس تشریح کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ کو انٹیم میکینکس ان تمام صورتوں سے نپٹ سکتی ہے جو چند حقیقی یا فرضی تجربات کے تصورات سے متعلق ہوں۔ اس لئے ایسے سوالات نہیں کرنے چاہئیں کہ ”حقیقت کیا ہے؟“ یا ”فلاں فلاں نظام کی حالت کیا ہے؟“ ایسے سوالات کے بجائے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ”اگر میں فلاں فلاں تجربہ فلاں فلاں حالات میں کروں تو میں کیا دیکھوں گا؟“

جب حقیقت کے متعلق دلائل بہت زیادہ گہرے ہو جائیں تو بہتر یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو ایک

جگہ روک کر محسوس کیا جائے کہ کیا یہ ”حقیقی“ ہے؟ مابعد الطبیعیات کی فضاؤں میں تصور کی اڑان اپنی جگہ درست، لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ”کوانٹم طبیعیات“ لاکھوں تجربات کی ٹھوس زمین پر قدم جمائے ہوئے ہے۔ سائنسی طریقہ اپنی قوت اور کلیت کے لحاظ سے اب بھی اتنا ہی معتبر ہے جتنا کہ پہلے تھا اور کوانٹم طبیعیات بھی اسی طریقے کی پیداوار ہے۔ اگر کبھی کوانٹم طبیعیات کی جگہ کوئی بہتر چیز لیتی ہے تو کونین (Kuhnian) قسم کی انقلابی تبدیلی کے ذریعہ ہی ایسا ہوگا۔ سائنس وقتاً فوقتاً اپنی اصلاح اور صفائی کرتی رہتی ہے اور کوئی متبادل نظریہ اس کی جگہ نہیں لے سکا۔ یہ متبادلات یا تو اعتقادات کے محدود نظام میں بند ہوتے ہیں یا اتنے زیادہ مبہم ہوتے ہیں کہ ان کے بانیوں اور حامیوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انہیں کس طرح بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

سائنس صرف ایک ہے۔ لیکن کیا یہ مغرب کی ایجاد اور ملکیت ہے؟
کیا جدید سائنس مغربی سائنس ہے؟

حال ہی میں شائع شدہ ایک کتاب میں دو نامور مغربی سائنس دانوں مائیکل مور اوچک اور جان زائمن نے تیسری دنیا کے ملکوں میں سائنس کے پھیلاؤ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا ہے: ”یورپی صنعتی تہذیب کے ساتھ ہی یورپی سائنس نے جنم لیا ہے۔ یہ سوال خالص کتابی ہو گیا ہے کہ آیا اس طرح ثقافت کی اپنی کوئی سائنس تھی یا نہیں؟ اقتصادی اور معاشی ترقی کا انحصار مکمل طور پر اس سائنسی سوچ پر ہے جس نے نشاۃ ثانیہ کے دوران یورپ میں جنم لیا۔ لہذا ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کریں گے کہ یورپی سائنس کو ایک عالمگیر قوت بنایا جائے۔“

کتاب کی مندرجہ بالا عبارت پڑھ کر دوسرے لوگوں نے کیا محسوس کیا؟ خصوصاً ایسے لوگوں نے جن کے ملکوں نے نوآبادیاتی غلامی کا دور دیکھا ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسے پڑھ کر مجھے یقیناً برا محسوس ہوا۔ میری طبیعت مگدر ہوئی اور عزت نفس مجروح ہوئی۔ صاف الفاظ میں دو مغربی سائنس دانوں نے اپنی برتری کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنی ثقافتی اقدار کو اتنا اچھا سمجھتے ہیں کہ انہیں دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سائنس دان ایک لحاظ سے پرانے زمانے کے عیسائی مبلغوں کی طرح ہیں جو عیسائی مذہب کو مغفرت کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے۔ جدید دور کے ان مغربی مبلغوں کا نصب العین یہ ہے کہ ”تمام دنیا میں یورپی سائنس غالب ثقافتی قوت ہو

جائے۔“ چنانچہ اس نصب العین کی روشنی میں مغلوب تہذیبوں کی ثقافتی اور سائنسی تاریخ کچرے کی ٹوکری میں پھینکنے کے قابل ہے۔

کئی لوگ جدید سائنس کے فلسفے اور تکنیک سے وفاداری کا اظہار کرتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں کہ یورپ میں سائنس کو زرخیز زمین میسر آئی۔ میں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ چینی، اسلامی اور ہندو تہذیبوں نے جو سائنسی ورثہ چھوڑا ہے، کیا اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ اگر ان عظیم تہذیبوں نے بنیاد نہ رکھی ہوتی تو کیا سائنسی ترقی ممکن تھی؟ اور جہاں تک مغرب کی نام نہاد اخلاقی برتری کا تعلق ہے، تو اس سوال کا کیا جواب ہے کہ کیا ہٹلر کا دور اور ہیروشیما یورپ کے اس کچرے کا نتیجہ نہیں تھے، جس کو عقلی اور سائنسی قرار دیا جاتا ہے؟ ہم اس تہذیب کو کیا کہیں جس نے دنیا کو ایٹمی تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے۔

اس حقیقت پر کوئی اعتراض نہیں کہ جدید سائنس کا آغاز یورپ میں تمدنی ہلچل، نشاۃ ثانیہ اور سائنسی انقلاب سے ہوا۔ یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ وسعت اور فطرت کے اعتبار سے زمانہ ماضی میں ان تہذیبوں کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ اس سے قبل سائنسی ترقی مختلف علاقوں میں ہوئی لیکن صنعتی انقلاب کے بعد ہی سائنس تہذیب و تمدن کا اہم جزو بن سکی۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ ایشیا یا افریقہ کے بجائے یورپ میں جدید سائنس کا آغاز محض ایک اتفاقی امر ہے۔

اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے میں عہد حاضر کے اہم ترین سوال کا حوالہ دوں گا جو برٹریڈ رسل نے اٹھایا۔ یہ سوال ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ”یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان جس کا دنیا سے واسطہ مختصراً ذاتی اور محدود ہوتا ہے، اتنا کچھ جاننے کی اہلیت رکھتا ہے جتنا کہ وہ جانتا ہے؟“ رسل کا مطلب یہ تھا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ انسان کی زندگی اوسطاً ساٹھ یا ستر سال سے زیادہ نہیں ہوتی، ہر شخص بہت زیادہ معلومات کا حامل ہوتا ہے۔ رسل کے اس سوال کی پوری معنویت صرف ایسے شخص کی سمجھ میں آ سکتی ہے جس نے کمپیوٹر میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہو۔

جدید ماہرین لسانیات رسل کے سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات اور فلسفی، نوم چومسکی کے بقول، ”ہم جتنا کچھ جانتے ہیں، وہ اس لئے جانتے ہیں کہ ہم جاننے کے لئے

ہی پیدا ہوئے ہیں۔“ وہ کافی ثبوت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ انسان قوت ناطقہ کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کے نتیجے میں ناطق یا عاقل انسان وجود میں آیا ہے۔ اس مخلوق کے دماغ کی ساخت ایسی ہے کہ وہ غور و فکر کر سکتا ہے۔ گویا وہ ایک پیچیدہ بغیر تار کا کمپیوٹر ہے۔ جسے شناختی اور تخلیقی عمل کے لئے صرف خارجی محرکات کی ضرورت ہوتی ہے۔ قوت ناطقہ انسان کے دماغ کی صلاحیت اور ادراک کا آئینہ ہے۔ چومسکی نے جو آفاقی انسانی گرامر دریافت کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی فکر اور اسالیب آفاقی ہیں۔ اس طرح ترقی کے جغرافیائی اور نسلی نظریات باطل ثابت ہو گئے ہیں اور نوع انسانی کی وحدت ثابت کی گئی ہے۔ انسانی دماغ کی استدلال اور تجزیاتی صلاحیتوں کا مطلب ہی یہ تھا کہ جلد یا بدیر سائنس وجود میں آئے گی۔

ان گنت ایسے دور گزرے ہیں جبکہ علم نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں بھی ایسے ہی کئی زمانے گزرنے والے ہوں۔ اگر کائناتی پیمانے سے ناپا جائے تو علم اور سائنس صرف چند ہی روز پرانے ہیں۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ سائنس کی ابتدا گزشتہ چند ہزار سال پہلے ہوئی تھی اور یہ یورپ کے خطے میں جدید سائنس نے چار سو سال پہلے جنم لیا۔ لہذا کسی ایک ثقافت کو سائنس کا مسکن اور منبع کہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس تمام بنی نوع انسان کی ذہنی ملکیت ہے اور یہ عالمی ثقافت کا ایک حصہ ہے۔

کلیسا اور سائنس کا ٹکراؤ

نشاۃ ثانیہ سے ایک ہزار سال پہلے تک عیسائی کلیسا کی یورپ پر مطلق حکمرانی تھی۔ عدم رواداری، تعصب اور توہم پرستی نے حصول علم اور سائنسی مطالعے کو ناممکن بنا دیا تھا۔ آزاد سوچ کی ہر کوشش سے بدگمان کلیسا نے ایسی ہر تعلیم کو ناجائز قرار دے دیا تھا جو براہ راست عیسائی تعلیمات کے مطابق نہیں تھی۔ مذہبی عدالتوں نے ہزاروں لاکھوں افراد کو جادو یا کفر کے الزام میں اذیتیں دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ سزا یافتہ مجرموں کی ٹانگیں دو گھوڑوں سے باندھ کر زندہ چیر دیا جاتا تھا، ان کی آنتیں باہر نکال دی جاتی تھیں، ستون پر لٹکا کر پھانسی دی جاتی تھی یا زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ مرے ہوؤں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پادری (آرچ بپ) اشٹرنجیل مقدس کا مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا نے اتوار 23 اکتوبر 4004 قبل مسیح کو صبح 9 بجے جنم لیا تھا، لیکن مدتوں پہلے مرے ہوئے سائنس دان وائی کلف نے فوسل اور ارضیات کا مطالعہ کر کے یہ کہا تھا کہ زمین چند کروڑ سال پرانی ہے۔ کلیسا نے مردہ وائی کلف کی یہ گستاخی معاف نہ کی۔ اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر ریزہ ریزہ کی گئیں اور سمندر میں پھینک دی گئیں تاکہ اختلاف اور شک کے جراثیم زمین کو آلودہ نہ کر سکیں۔ آخر کلیسا بیکن، وائی کلف، برنو، گلیلیو اور دیگر ہزار ہا کمتر جدید خیالات کے حامل مفکروں کے اتنا خلاف کیوں تھا؟ میرے خیال میں اس سخت مخالفت کے مندرجہ ذیل اسباب تھے:

1- معاشرے کا سارا نظام کلیسا کے نافذ کردہ قواعد و احکام کی من و عن پابندی پر مبنی تھا۔

عبادت کے طریقے، کھانے پینے، شادی اور جنسی مباشرت، غرضیکہ ہر چیز کے لئے ایک قاعدہ یا ایک قانون تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کا عیسائی مذہب ایک مکمل ضابطہ حیات تھا۔

2- یہ قاعدے اور انہیں نافذ کرنے کے کلیسائی اختیارات کا انحصار کلیسا کے احکامات کی مکمل قبولیت اور بے چون و چراں تابعداری پر تھا۔

3- ان عقائد اور احکام میں سے کسی ایک کا بھی انکار یا خلاف ورزی، خواہ اس کا کرنے والا کوئی سائنس دان ہو یا عام آدمی کو درگزر کرنا ناممکن تھا، کیونکہ یہ رعایت تمام معاشرتی عمارت کی تباہی پر منتج ہو سکتی تھی۔

4- اس لئے سائنس اور ہر قسم کی آزاد خیالی ایک خطرہ تھی۔ جسے ممنوع قرار دینا ضروری تھا۔ گلیلیو پر نازل کئے جانے والے عتاب کو مندرجہ ذیل سیاق و سباق میں دیکھا جانا چاہیے۔ کلیسا نے گلیلیو کو جو سزا دی، گو وہ بہت سخت تھی، تاہم خصوصی معنویت کی حامل تھی، اس ضمن میں برنارڈو شا کا تجزیہ ملاحظہ ہو

”گلیلیو ہمارے سائنس دانوں کا مقبول موضوع ہے، لیکن اصل نکتہ خطا ہو جاتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ”متنازعہ معاملہ یہ تھا کہ آیا زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے یا یہ ایک ساکن مرکز ہے جس کے گرد سورج گھومتا ہے۔ دراصل معاملہ یہ نہیں تھا۔ بجائے خود یہ اخلاقی معنویت سے عاری محض ایک مادی حقیقت تھی۔ اس لئے کلیسا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن کلیسائی ارباب اختیار کو جو فکر لاحق ہوئی، وہ یہ تھی کہ آیا عیسائی مذہب اس دریافت کے صدے کی تاب لاسکے گا۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ یہ سمجھتے تھے کہ نہ صرف عیسائی تہذیب بلکہ ساری دنیا کی تہذیب کا انحصار عیسائی مذہب پر ہے اور دوسری طرف وہ ان قصوں کو سچ سمجھتے تھے، جن میں جنگ گیان میں جو شوا کی جنگی حکمت عملی سے لے کر حضرت عیسیٰ کے آسمان پر اٹھانے جانے کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ انہیں ڈر تھا کہ کہیں یہ پتہ نہ چل جائے کہ ان صحیفوں اور قصوں کا خالق ایک ایسی ہستی ہے جسے مادی کائنات کی حقیقت کا علم نہیں۔“

ازمنہ وسطیٰ کے کلیسا نے چونکہ سائنسی سوچ کو دبا یا تھا، اس لئے یہ عہد تاریخ کا تاریک ترین دور سمجھا جاتا ہے۔ کئی عالموں اور تاریخی تحقیق کرنے والوں نے اس عہد کا مطالعہ نہایت احتیاط اور باریک بینی سے کیا ہے۔ اس ضمن میں اینڈریو ڈکسن وائٹ کی 1896ء میں طبع شدہ دو

جلدی کتاب:

"A History of the Warfare of Science with Theology"

قابل ذکر ہے۔ واٹ بعد میں کورنیل یونیورسٹی کا صدر مقرر ہوا۔ اس کی جامع کتاب میں کئی دلچسپ واقعات درج ہیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں

☆ عیسائی علماء نے زمین کی گولائی اور نقاط متقابل کے نظریات پر سخت اعتراضات کئے۔ انہوں نے پوچھا: ”کیا کوئی اتنا بھی بے عقل ہو سکتا ہے جو اس بات پر یقین لے آئے کہ درخت اور فصلوں کے پودے نیچے کی طرف بڑھتے ہیں؟۔۔۔۔۔ یا بارش اور برف اوپر کی طرف گرتی ہیں؟“ سینٹ آگسٹائن جیسے مذہبی رہنما نے کلیسا کو کرہ زمین کے دونوں طرف متقابل نقاط کے نظریے کا سخت مخالف بنا دیا تھا اور ایک ہزار سال تک اس بات کو عقیدے کی حیثیت حاصل رہی کہ اگر زمین کی متقابل طرفین ہوں تو پھر بھی اس کی دوسری طرف انسان کا وجود نہیں ہو سکتا۔ چھٹی صدی عیسوی میں غزہ کے پروکوپیوس نے اس مسئلہ پر مذہب کا تمام زور صرف کر کے یہ اعلان کیا کہ زمین کی متقابل طرف ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عیسیٰ مسیح دوسری طرف بھی جاتے اور دوبارہ انسانیت کے لئے مصائب برداشت کرتے۔ اس کے علاوہ بہشت، آدم، سانپ اور طوفان نوح دو دو ہوتے، لیکن چونکہ یہ صریحاً غلط ہے اس لئے زمین کی متقابل طرفین نہیں ہو سکتی ہیں۔

☆ سینٹ پال نے کہا کہ بیماریاں شیطان کے قبیح اعمال ہیں۔ کلیسا کے با اختیار فرد اور یگن نے کہا: ”یہ عفریت ہیں جو قحط، بخر پن، ہوا کی کثافت، وبائی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ وہ نچلی فضا کے بادلوں میں چھپے رہتے ہیں اور کفار جب ان کو دیکھتا جان کر خون اور خوشبو پیش کرتے ہیں تو وہ کشت محسوس کرتے ہیں“۔ اور کلیسا کے ابتدائی ارباب اختیار میں سب سے زیادہ با اثر سینٹ آگسٹائن نے لکھا کہ ”عیسائیوں کی تمام بیماریوں کا ذمہ دار ان عفریتوں کو قرار دینا چاہیے وہ خصوصاً نئے بننے والے عیسائیوں کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ ہاں، معصوم نوزائیدہ بچوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ پوپ پائیس پنجم کے احکام کے مطابق تمام اطباء پر لازم تھا کہ وہ ”روح کے طبیب کو بھی بلائیں“۔ کیونکہ ”جسمانی بیماری اکثر گناہ کا نتیجہ ہوتی ہے“۔ چونکہ شیاطین اور بدروحیں بیماری کا سبب ہوتی ہیں اس لئے علاج مقدس تبرکات کے ذریعہ آسب اتار کر کرنا

چاہیے۔ ایسے گرجاؤں اور خانقاہوں کو علاج سے بہت آمدنی ہوتی تھی، جو مقدس تبرکات کے لئے مشہور تھے۔ کلیسا نہ صرف روح کا محافظ بلکہ جسمانی صحت کا بھی امین تھا کیونکہ کلیسا کے نزدیک بیماریاں مثلاً چیچک، ہیضہ وغیرہ خدا کی طرف سے نازل ہونے والے قہر تھے۔ اس لئے کٹر مذہبی عیسائی ان بیماریوں سے محفوظ کرنے کے ٹیکوں وغیرہ کے شدید مخالف تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چیچک ”لوگوں کے گناہوں کے پاداش میں خدا کا فیصلہ ہے“۔ اس لئے اس کا علاج ”خدا کو مزید ناراض کرنے کے مترادف ہے“۔ اس شخص کے گھر میں ایک جلتا ہوا گولہ پھینکا گیا جس نے چیچک کے ٹیکے کے موجود ڈاکٹر بوائکسٹن کو پناہ دی تھی۔ گرجاؤں سے چیچک کے ٹیکے کے حامیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ لیکن حقائق (باطل کے حملہ آوروں سے زیادہ) مضبوط تھے۔ ٹیکہ لگوا کر لوگ زندہ رہتے تھے اور ٹیکہ لگوائے بغیر مر جاتے تھے۔ اس طرح آخر کار کلیسا نے مجبوراً ٹیکے کو قبول کر لیا، گو اس کی مخالفت کبھی کلی طور پر ختم نہیں ہوئی۔

☆ سائنسی طب کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ چیڑ پھاڑ کر کے مردہ جسموں کے معائنے کی مخالفت تھی۔ سینٹ آگسٹائن جسم کے تشریح کاروں کو قصائی کہتا تھا اور اس کام کی شدید مذمت کرتا تھا۔ عام طور پر دلوں میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ مردہ جسم کی چیڑ پھاڑ کے نتیجہ میں قیامت کے روز (جبکہ مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے) کوئی ناقابل تصور عذاب نازل ہوگا۔ اس دلیل پر کلیسا نے یہ اضافہ کیا کہ ”کلیسا خون بہانے سے نفرت کرتا ہے“۔ یہ واقعی بہت عجیب دلیل تھی۔ جب مقدس مفاد میں ہزاروں مشتبہ کافروں، منافقوں اور جادوگریوں کو زندہ نذر آتش کیا تو اس وقت کلیسا کو خون بہانے سے کوئی نفرت محسوس نہیں ہوئی۔

☆ 1770ء کے لگ بھگ مختلف حصوں میں ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ سائنس کی شاہی اکیڈمی کو تفصیلی بیانات ارسال کئے گئے۔ جس میں یہ کہا گیا کہ پانی تبدیل ہو کر خون بن گیا۔ اس کو مذہبی علماء اور پادریوں نے فوراً خدائی قہر کی علامت قرار دیا۔ جب اس قسم کے معجزہ کو سویڈن میں دیکھا گیا، تو ایک نامور نیچری لٹائیس نے اس مظہر کا سائنسی مطالعہ کر کے یہ دریافت کیا کہ پانی چھوٹے چھوٹے سرخ جراثیم کی وجہ سے سرخ دکھائی دیتا ہے۔ جب اس دریافت کی خبر ہشپ کو پہنچی تو اس نے اسے سخت الفاظ میں ”شیطانی عار“ کہہ کر مذمت کی اور اعلان کیا کہ ”پانی کا سرخ ہونا قدرتی نہیں ہے“۔ بے چارہ لٹائیس بہادر آدمی نہیں تھا، اسے

گلیڈیو کا حشر اچھی طرح معلوم تھا۔ اس لئے اس نے پسپائی اختیار کی اور یہ اعلان کیا کہ اس معاملے کی حقیقت اس کی فہم سے بالا ہے۔

☆ ازمنہ وسطیٰ کے کلیسا سے تعلق رکھنے والے مذہبی علماء اور پادریوں نے شدت کے ساتھ اس نظریے کا پرچار کیا تھا کہ شہاب ثاقب آگ کے گولے ہوتے ہیں جو ناراض خدا بدکردار دنیا کی طرف پھینکتا ہے۔ اہل کلیسا شہاب ثاقب کی اخلاقی نوعیت اس طرح بیان کرتے تھے: یہ شہاب ثاقب خدا کی طرف سے اس تلوار کی طرح ہے جو منصف عدالت میں اپنے اور ملزم کے درمیان رکھتا ہے۔ ان لوگوں کی بھی مذمت کی جاتی تھی جو ایسی خدائی تشبیہ کی پروا نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو ان چمچڑوں سے تشبیہ دی جاتی تھی جو اناج بھرے کوٹھے کے دروازے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ سترھویں صدی کے اختتام تک بھی حلف لینے کی وجہ سے فلکیات کے پروفیسر صاحبان یہ نہیں پڑھا سکتے تھے کہ شہاب ثاقب طبعی قوانین کے تابع اجرام فلکی ہوتے ہیں۔ لیکن سائنسی معلومات کو زیادہ عرصے تک دبائے رکھنا ناممکن تھا۔ ہیلی نے نیوٹن اور کپلر کے قوانین کی بنیاد پر ایک خاص ”خطرناک“ دم دار ستارے کا مدار دریافت کیا اور یہ پیش گوئی کی کہ یہ ٹھیک 76 سال میں گردش پوری کرے گا اور اس مقام پر دوبارہ نظر آئے گا جہاں ہم نے اسے دیکھا ہے۔ اس نے منٹ تک کا حساب لگا کر یہ بتایا کہ وہ دوبارہ کب آسمان کے ایک خاص نقطہ پر نظر آئے گا۔ یہ پیش گوئی ناقابل یقین تھی لیکن 76 سال بعد جبکہ ہیلی اور نیوٹن دونوں بہت عرصہ پہلے مر چکے تھے، ہیلی کا دم دار ستارا ٹھیک اس وقت اور اس مقام پر دیکھا گیا جس کی پیش گوئی کی گئی تھی۔

☆ کٹر مذہبی عیسائیوں کے نزدیک علم ارضیات ایک شیطانی علم تھا۔ ارضیات کے شواہد نہ صرف زمین کی عمر کے بارے میں بشارتوں کے دعوے کو جھٹلاتے تھے بلکہ یہ بھی بتاتے تھے کہ چھ دن میں اس کی تخلیق ناممکن تھی۔ کٹر مذہب پرستوں نے ارضیات کے متعلق اعلان کیا کہ یہ ”قانون کی رو سے جائز تحقیق نہیں ہے“۔ اس کو ”تاریک فن“ اور ”جہنمی توپ خانے“ کے نام دیئے اور اس شعبہ علم کے محققوں کو ”کافر“ اور ”مقدس تاریخ کو جھٹلانے والے“ قرار دیا۔ پوپ پارسا نہم بلاشبہ اس مکتب خیال کا حمایتی تھا۔ ورنہ وہ 1850ء میں اٹلی کے شہر بولونیا میں منعقد ہونے والی سائنسی کانگریس کو ممنوع قرار نہ دیتا۔

ازمنہ وسطیٰ میں یہ عقیدہ عام تھا کہ طوفان شیطان لاتا ہے۔ اس عقیدے کو سینٹ آگسٹائن جیسے مقدس شخص کی حمایت حاصل تھی۔ یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا کہ طوفان لانا عفریتوں کا کام ہے۔ ہوا کی اس مافوق الفطرت طاقت کے خلاف جھاڑ پھونک کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے تھے۔ ان طریقوں میں سب سے زیادہ عام تیرہویں پوپ گریگوری کا طریقہ تھا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں یہ الم انگیز عقیدہ عام ہو گیا کہ بعض عورتیں بگولوں، آندھیوں، طوفانوں، سیلابوں وغیرہ کے ذریعہ جہنمی طاقتوں کی مدد حاصل کرتی ہیں جبکہ اس سے پہلے مختلف دعائیں، منتر وغیرہ پڑھ کر اور گرجا کی گھنٹیاں بجا کر طوفان کو ٹالا جاتا رہا تھا۔ سات دسمبر 1784 کو آٹھویں پوپ انوسینٹ نے انجیل کے حکم ”تم جادو گر نیوں کو زندہ نہیں چھوڑو گے“ سے متاثر ہو کر ایک فرمان جاری کیا جس میں جرمنی کے پادریوں کو تاکید کی گئی کہ وہ ایسے جادوگروں اور جادو گر نیوں کا سراغ لگائیں جو موسم کو خراب کر کے انگور کے کھیتوں، باغوں، چراگاہوں اور فصلوں کو تباہ کرتے ہیں۔ اس فرمان کے نتیجے میں ہزاروں عورتیں قید کی گئیں، انہیں اذیت پہنچائی گئی، ان کے قریبی عزیز بھی ان سے خوف کھانے لگے یا یہ چاہنے لگے کہ موت کے ذریعہ ان کو اذیت سے نجات مل جائے۔

☆ کلیسائی عقیدے کے مطابق مندرجہ ذیل پانچ گناہوں کی پاداش میں بجلی گرتی ہے۔ گناہوں سے توبہ نہ کرنا، مذہب پر یقین نہ کرنا، گرجاؤں کی مرمت میں لاپرواہی برتنا، پادری کو عشر دینے میں فریب دہی، ماتحتوں پر ظلم۔ ایک کے بعد دوسرے پوپ نے عقوبت کے اس مقدس فرمان پر زور دیا اور اسے ”مشیت ایزدی“ قرار دیا۔ پھر یہ ہوا کہ 1752 عیسوی میں بینجمن فریلکسن نے طوفان برق و باراں کے دوران اپنی مشہور پتنگ اڑائی اور اس خطرناک تجربے کے ذریعہ یہ دریافت کیا کہ بجلی کا گرنا دراصل برقی طاقت ہے۔ اس کے فوراً بعد برقی چھڑی ایجاد ہوئی جو خوفناک ترین برقی طوفان سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ پہلے تو کلیسا نے اس کا وجود تسلیم نہیں کیا، لیکن جب اس کی کامیابی کو وسیع پیمانے پر مان لیا گیا اور برق سے حفاظت کی چھڑیاں زیادہ نصب کی جانے لگیں، تو کٹر مذہبی پادریوں نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ ان لوگوں نے میساچوسٹس میں 1755ء کے زلزلے کا سبب بوٹن کی ان چھتر یوں کو قرار دیا اور واعظ ان لوگوں کے خلاف انتہائی غصے میں بولنے لگے جو آسمانی یا خدائی توپ خانے کو تسخیر

کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان چھتریوں کی کلیسائی مخالفت زیادہ عرصے تک جاری رہتی اگر بجلی گرنے سے وہ گرجے منہدم نہ ہوتے جن پر یہ چھڑیاں نصب نہیں کی گئی تھیں۔ جرمنی میں 1750ء سے 1783ء کے درمیان بجلی گرنے سے تقریباً چار سو گرجاؤں کو نقصان پہنچا اور ایک سو بیس (گرجا کی) گھنٹی بجانے والے ہلاک ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شہر کے وہ قصبہ خانے جن پر چھڑیاں نصب تھیں، محفوظ رہے اور دوسری طرف ایسے گرجا گھر جو ان محافظ چھڑیوں سے محروم تھے، برباد ہو گئے۔ اس کے برعکس ان گرجاؤں کو کوئی گزند نہیں پہنچا جن پر چھڑیاں نصب کی گئی تھیں۔ چنانچہ مجبوراً کلیسا نے اٹھارہویں صدی کے آخر میں ایک مقدس فرمان کے ذریعہ برقی تحفظ کی چھڑیوں کو قبول کر لیا۔

☆ جب امینوئل کانٹ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ خلاء میں صرف ستارے ہی نہیں بلکہ گیسوں کے بادل ہوتے ہیں تو ساری مذہبی دنیا نے اس ”کفر“ کے خلاف شور مچا دیا۔ عیسائیوں نے کہا کہ یہ نظریہ مذہبی صحیفوں میں نہیں پایا جاتا، اس لئے ایسے بادلوں کا وجود نہیں ہونا چاہیے۔ اس نظریے کے مخالفین اس وقت بہت خوش ہوئے جب نئی دور بینوں کی ایجاد سے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض بادل دراصل ستاروں کے جگمگاتے ہیں لیکن یہ خوشی صرف چند روزہ تھی کیونکہ بادل سے نکلنے والی روشنی سے سائنس دانوں کو یقین ہو گیا کہ کچھ روشنی ایسے ایٹموں سے بھی خارج ہوتی ہے جو ستاروں میں نہیں بلکہ گیس کی حالت میں موجود ہوتے ہیں۔

ازمنہ وسطیٰ کی عیسائیت نے انسان کی روح اور سائنسی تحقیق کو کچلنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے، ان کی فہرست بہت طویل ہے، جس میں سے کچھ نمونے نقل کئے گئے ہیں۔

1859ء میں ڈارون کی ”Origin of Species“ ”چھپنے کے بعد سائنس اور کٹر مذہب پرستوں کے درمیان جو عظیم جنگ ہوئی۔ میں نے اس پر بحث کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ یہ معرکہ اس سے پہلے کے تمام معرکوں پر چھا گیا۔ یہ گلیلیو کے معرکے سے بھی زیادہ ہنگامہ خیز تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نوع انسان کے لئے گرتی ہوئی چٹانوں یا فلکی اجرام کے متعلق سائنسی ہونا اتنا مشکل نہ تھا جتنا کہ خود اپنی زندگی کے بارے میں سائنسی رویہ اختیار کرنا مشکل ثابت ہوا۔

قوت نمو اور جان داروں کی بے ساختہ حرکات گہرے ادہام کا شکار رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔

اس مخصوص مسئلہ پر سائنس اور کٹر عیسائیت کے درمیان تنازعہ آج بھی امریکہ میں ”آفرینش“ کی تحریک سے عیاں ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں 1980ء کی دہائی میں رونا لڈر ریگن کے دور صدارت میں شروع ہوئی اور کئی امریکی ریاستوں میں خاصی طاقت کی حامل ہے۔ اس کا کلیدی اعتقاد یہ ہے کہ چھ ہزار سال پہلے ٹھیک سات دن کے اندر کائنات میں زندگی عدم سے وجود میں آئی اور بالکل اس طرح وجود میں آئی جس طرح کہ ”کتاب آفرینش“ کے ابتدائی ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر عظیم طوفان نوح کو ایک تاریخی حقیقت تسلیم کیا جاتا ہے، اسے محض، تمثیل نہیں سمجھا جاتا۔ تحریک آفرینش، فلکیات اور ارضیات پر اس بنا پر نکتہ چیں ہے کہ یہ علوم زمین کی عمر کی حد دس ہزار سال متعین نہیں کرتے۔ تعین کے ریڈیائی طریقے کو یہ تحریک مسترد کرتی ہے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقا پر تحریک آفرینش کو سب سے زیادہ اعتراض ہے۔ حال ہی میں ریاست جارجیا کے جج براسیول ڈین نے لکھا ہے کہ ڈارون کی بندر کہانی اباحت، آزاد جنسی تعلقات، ضبط تولید کی گولیوں، حفظ ماتقدم کی تدابیر، غیر فطری افعال، حمل، اسقاط حمل، فحاشی، آلودگی اور توسیع جرائم کو جنم دیتی ہے۔

عقل دشمنی کے اس احیا کے باوجود خردمندی کے لئے جدوجہد کرنے والے ہارے نہیں ہیں۔ یہ دیکھ کر حوصلہ بڑھتا ہے کہ عیسائی بنیاد پرستوں کو کئی شکستیں ہوئی ہیں اور وہ مغرب میں سائنس کے نظام کو نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ وہ تعلیمی اداروں سے اپنا یہ مطالبہ نہیں تسلیم کرا سکے کہ آفرینش کے متعلق سائنس کے نظریہ اور انجیل کے نظریہ کو مساوی وقت دیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ریگن کے کرسی صدارت چھوڑنے کے بعد تحریک آفرینش کے حامیوں کے بھی برے دن آگئے ہیں۔

اس کے علاوہ جدید دنیا نے رومن کیتھولک کلیسا کے وہ مظالم نہیں بھلائے ہیں جو اس نے سائنس دانوں پر کئے تھے۔ خصوصاً گلیلیو پر کیا گیا ظلم ایک علامت بن گیا ہے کیونکہ اسے اپنے سائنسی نظریات کی مذمت کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ 9 مئی 1983ء کو ویٹی کن کی ایک خصوصی تقریب میں پوپ پال دوم نے ایک بیان جاری کیا جسے گویا گلیلیو کے واقعہ کا سرکاری معافی نامہ سمجھنا چاہیے۔

”گلیلیو کے واقعے کے دوران اور اس کے بعد کلیسا کے تجربہ نے زیادہ پختہ رویے کی طرف

باب چار

اسلامی ملکوں میں سائنس کی موجودہ حالت

”اس میں کوئی شک نہیں کہ کرہ ارض پر تمام ممالک میں سے اسلامی ممالک سائنس کے میدان میں سب سے زیادہ پسماندہ ہیں۔ اس کمزوری کے خطرات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ آج کل کے زمانے میں کسی معاشرے کی بقاء کا انحصار اس میں موجود سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی و ترویج پر ہے۔“

(عبدالسلام)

ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے کے لئے کراچی سے تہران اور دہلی سے ریاض تک شہروں کے نظارے میں بہت کم فرق ہوتا ہے۔ یہ مماثلت اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان شہروں کے باشندوں کا مذہب ایک ہے۔ اصل وجہ مغربی ٹیکنالوجی ہے۔ جس نے ان شہروں کو فولاد اور شیشے کی کئی منزلہ عمارتیں، جدید ہوائی اڈے اور ان پر کھڑے چکنے اور چمکدار ہوائی جہاز، کاروں سے بھری شاہراہیں اور ہر مکان پر نصب ٹیلی ویژن انٹینا دیئے ہیں۔ وہ ٹیکنالوجی بھی جو ان معاشروں کو بنیادی معاش فراہم کرتی ہے، باہر سے درآمد کی گئی ہے۔ تیل کی تلاش، کنوئیں کھودنا، تیل نکالنا، صاف کرنا اور پھر اس کی ترسیل خصوصاً اہم مثالیں ہیں۔ ان کی وجہ سے سعودی عرب اور ایران جیسے ملک اپنی قدرتی دولت کے بدلے جدید جنگی طیارے سے لے کر رافٹل کی گولیاں اور تیل صاف کرنے کے کارخانے سے لے کر ڈبہ کھولنے کے اوزار تک حاصل کرتے ہیں۔ آئندہ چند دہائیوں تک زمین کی تہہ سے حاصل ہونے والا تیل ان ملکوں کا

سائنس کی پیمائش

سائنس کی پیمائش کیسے کی جائے؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ طے کیا جائے کہ ”سائنس“ کا مطلب کیا ہے۔ دراصل سائنس کی تعریف اتنی آسان نہیں ہے جتنی کہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ سائنس کئی مختلف طریقوں سے ہماری روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس نے ہماری زندگی کی ہیئت میں بڑی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ تاہم، قاری کی تفہیم کے لئے یہ بات مفید ہوگی اگر مندرجہ ذیل پانچ کلیدی صورتوں کی نشاندہی کی جائے جو واضح کرتی ہیں کہ سائنس عصری دنیا اور دور حاضر میں کہاں اور کیسے پائی جاتی ہے۔

- 1- صنعتی پیداواری عمل کی بنیاد کے طور پر۔
 - 2- ایسے سائنس دانوں کی اجتماعی اور منظم حیثیت کی صورت میں، جو سائنس کو کل وقتی پیشے کے طور پر اپنائے ہوئے ہیں۔
 - 3- بطور ایک فکری نظام کے۔ جو کائنات کے متعلق انسان کے روایتی عقیدوں اور رویوں میں تبدیلی پیدا کر دے یا اسے دنیا کے متعلق سائنسی نظریے کا قائل کر دے۔
 - 4- ایک باقاعدہ طریق کار کی صورت میں۔ وہ طریق کار جو مشاہدہ، تجربہ، درجہ بندی اور پیمائش و میزان کو مختلف کلیوں، مفروضوں اور نظریات کی پرکھ یا جانچ کے لئے استعمال کرتا ہے۔
 - 5- ہر لمحہ بڑھتے ہوئے علم اور معلومات کی صورت میں، کیونکہ علم کی تعمیر میں اضافہ گزشتہ سائنس دانوں، عالموں اور کارکنوں کے تجربات اور دریافتوں کی بنیادوں پر ہوتا ہے۔
- سائنس کی یہ تشریح وہ نظریاتی فریم ورک یا ڈھانچہ ہے جس کے اندر رہ کر ہم مسلم ممالک میں سائنس کی صورت حال کو زیر بحث لائیں گے۔
- ### پیداواری عمل میں سائنس کا استعمال
- ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ جدید دنیا میں سائنس کو اس لئے اہمیت حاصل ہوئی کہ یہ معیشت کی ضرورت بن چکی ہے۔ خصوصاً مارکسی نظریے کے حامل اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سائنس معاشی محرکات کے نتیجے میں پیدا ہوئی نہ کہ بعض ایسے داخلی ذہنی دباؤ کی وجہ سے جو فرد کو اپنے ماحول کی تحقیق کے لئے مجبور کرتا ہے۔ 1894ء میں فریڈرک اینگلز نے اسٹارکن برگ کو اپنے خط میں اس بات کو مندرجہ ذیل طور میں واضح کیا:

1992ء میں مشین سازی میں اضافی قدر کا موازنہ

ملک	آبادی (ملین میں)	فی کس اضافی قدر (امریکی ڈالر میں)
بنگلہ دیش	115.2	18.78
الجزیریا	26.7	150.18
پاکستان	122.8	61.38
انڈونیشیا	187.2	148.79
مصر	56.4	101.89
ترکی	59.6	460.82
بھارت	898.2	46.26
جاپان	124.5	8217.25
برطانیہ	57.9	3486.3

(ماخوذ ورلڈ بینک رپورٹ)

تجارتی سامان کی برآمد کا نظام کسی ملک کے صنعتی ہونے کی ایک اور علامت ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل فہرست میں چند منتخب ممالک کی صنعتی پیداوار اور سامان نقل و حمل کی برآمدات کی شرح فیصد بمقابلہ کل برآمدات پیش کی جاتی ہے۔ (3)

مشین اور سامان نقل و حمل کا کل برآمدات سے تناسب

ملک	فیصد
بنگلہ دیش	صفر
پاکستان	3
مصر	17

7	ترکی
27	ملائیشیا
32	بھارت
47	امریکہ
65	جاپان

(ماخوذ ورلڈ بینک رپورٹ)

چھالیس مسلم ممالک میں سے صرف 24 سینٹ، 11 شکر، 5 وزنی انجینئری مصنوعات، 6 کپڑا اور 5 ہلکا اسلحہ پیدا کرتے ہیں۔

زیادہ تر مسلم ممالک کچا مال پیدا کرتے ہیں، جس میں تیل سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ ملک دنیا کے تیل کا 56 فیصد، قدرتی گیس کا 37 فیصد، جیوٹ کا 80 فیصد، ربڑ کا 70 فیصد، پام آئل کا 75 فیصد، اناج کا 25 فیصد، روئی کا 13 فیصد اور گنے کا 10 فیصد پیدا کرتے ہیں۔

مجموعی غیر ملکی تجارت کی 94 فیصد تجارت غیر مسلم ملکوں سے ہوتی ہے۔ مسلم ممالک کے درمیان باہمی تجارت صرف 6 فیصد ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم ممالک تیسری دنیا کے غیر مسلم ممالک کی بہ نسبت زیادہ متمول ہیں۔ متمول ترین مسلم ملک متحدہ عرب امارات ہے، جس میں فی کس قومی آمدنی 15,830 ڈالر ہے جو جاپان کی 15,760 ڈالر فی کس آمدنی سے زیادہ ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تیسری دنیا کے دیگر ملکوں کی بہ نسبت مسلم ممالک میں زیادہ لوگ شہری علاقوں میں رہتے ہیں، 1986ء میں مسلم ممالک کی آبادی میں شرح ولادت مقابلاً زیادہ تھی

تیسری دنیا	مسلم دنیا	فی کس جی۔ این۔ پی
300 ڈالر	856 ڈالر	شہری آبادی
34 فیصد	40 فیصد	شرح ولادت
3.1 فیصد	4.1 فیصد	

ان اعداد و شمار کا مطلب واضح ہے۔ اہم مسلم ممالک، خصوصاً تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں،

معیشت کی نیچے، ”کھودنے اور نکالنے کے عمل“ کی ہے۔ نسبتاً ترقی یافتہ ملک جو تیل برآمد نہیں کرتے مثلاً مصر اور پاکستان کی معیشت بھی یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان میں صنعتی اضافی قدر کا حصہ بہت کم ہے۔ اس لئے پیداوار میں سائنس کی اہمیت برائے نام ہے اور اس کی ترقی کے لئے ترغیبات بہت کم ہیں۔

سائنس اور سائنس دان

”سائنس دان“ کی اصطلاح ویویل نے 1840ء میں ایجاد کی۔ اس سے پہلے یہ لفظ لغت میں نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کا مطالعہ کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی کہ ان سے منسوب انگریزی زبان میں ایک نئے لفظ کا اضافہ کیا جاتا۔ لیکن بیسویں صدی میں سائنس ایک ایسی تحریک بن گئی ہے جس میں لاکھوں افراد حصہ لے رہے ہیں اور روزگار کماتے ہیں۔ تمام دنیا، بشمول ترقی پذیر ممالک کے سائنس دانوں کی ایک نئی آفاقی برادری تیزی سے وجود میں آ رہی ہے۔ لیکن اس ترقی کی رفتار مسلم ملکوں میں نسبتاً سست ہے۔ ان ملکوں میں سائنس دانوں کی برادری بقیہ دنیا کے ملکوں کے مقابلے میں نہ صرف چھوٹی ہے بلکہ ان کی سائنسی پیداوار بھی کم ہے۔ اس میدان میں مسلم ممالک تیسری دنیا کے دیگر ملکوں سے بھی کچھڑے ہوئے ہیں۔ کچھ اعداد و شمار مندرجہ ذیل ہیں۔

1976ء میں سائنسی تصنیفات کی تعداد

352,000	تمام دنیا میں
19,000	تیسری دنیا میں
3,300	مسلم ممالک میں
6,100 (تقریباً)	اسرائیل میں
مسلم ممالک میں سب سے زیادہ سائنسی مقالات لکھنے والوں کی تعداد مصر، ایران، پاکستان، نايجیر یا ترکی، ملائیشیا اور لبنان میں ہے۔ ایک اور گوشوارہ جس میں سائنسی ادب میں چند ممالک کا حصہ بتایا گیا ہے مندرجہ ذیل ہے:	
0.21 فیصد	مصر
0.043 فیصد	ایران

عراق	0.022 فیصد
لیبیا	0.002 فیصد
پاکستان	0.055 فیصد
سعودی عرب	0.008 فیصد
شام	0.001 فیصد
بھارت	2.260 فیصد

1976ء میں سائنسی تصنیف کی شرح فیصد بمقابلہ کل دنیا)

اگر ہم ہر اس مصنف کو مسلمان سمجھ لیں، جس کا نام مسلمانوں جیسا ہو تو دور حاضر میں مختلف سائنسی شعبوں میں کام کرنے والے مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ راقم نے 1989ء میں شائع ہونے والے سائنسی ادب کا چھوٹے پیمانے پر جائزہ لیا جس کے نتائج مندرجہ ذیل ہیں:

شعبہ	جائزے میں شامل کل مصنفین	مسلمان مصنفین
طبیعیات	4188	46
ریاضی	5050	53
کیمیا	5375	128

اگر اس بات کی گنجائش رکھی جائے کہ کچھ مسلمان مصنفین کے نام عربی، فارسی، ترکی نہیں ہوں گے تو مسلم مصنفوں کی تعداد میں بیس سے تیس فیصد تک کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہوگا کہ مسلمان مصنفوں کی تعداد مایوس کن حد تک کم ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ تقریباً نصف مسلمان مصنفوں کے پتے مغربی ممالک میں اداروں کی معرفت دیئے گئے ہیں۔

ہر سال سائنسی حوالہ جات کی ایک عالمی فہرست شائع کی جاتی ہے جس کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی سائنسی کام کی کتنی وقعت ہے اس سے حاصل کردہ کچھ اعداد و شمار جو

1988ء سے متعلق ہیں درج ذیل ہیں:

تصانیف کی تعداد	آبادی (کروڑوں میں)	ملک
25	3.1	ارجنٹائن
1.8	10.4	بنگلہ دیش
33	14.1	برازیل
17	4.9	مصر
90	70.0	بھارت
2.5	15.0	انڈونیشیا
2	5.0	ایران
4	1.7	عراق
72	0.45	اسرائیل
4	1.65	ملائیشیا
4	10.2	پاکستان
10.5	5.1	ترکی

مندرجہ بالا نتائج دیگر اندازوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔ عربوں اور اسرائیلیوں کی فی کس سائنسی پیداوار کا تقابل کرنے کے بعد اے۔ بی۔ ڈھلان اس نتیجہ پر پہنچا کہ عرب ممالک کی پیداوار اسرائیل کا صرف ایک فیصد ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ عربوں کے لئے مادی وسائل کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گو عرب ملکوں کی کل قومی پیداوار 1967ء کے 25 بلین ڈالر سے بڑھ کر 1976ء میں 140 بلین ڈالر ہو گئی، لیکن سائنسی تحصیل میں برائے نام ہی اضافہ ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1967ء کی جنگ میں عربوں کی شکست کا خاص سبب سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کی پسماندگی کو قرار دیا گیا تھا، اس لئے خیال یہ تھا کہ عربوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے حصول کی شدید خواہش پیدا ہوگی۔ لیکن اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خیال غلط تھا۔

اب میں پاکستان کے تعلق سے سائنس کے تنظیمی پہلو سے مختصر بحث کروں گا۔ پاکستان میں کاغذ پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے 133 ادارے ہیں۔ ان میں تحقیق و ترقی سے متعلق بڑے بڑے اداروں PAEC (جوہری توانائی PCSIR (صنعتی تحقیق) اور SUPARCO (خلائی تحقیق) سے لے کر چھوٹے چھوٹے ادارے (جن کے دفاتر چند کمروں پر مشتمل ہیں) شامل ہیں۔ ساز و سامان کافی ہے۔ بھارت کی بہ نسبت تنخواہیں 30 سے 50 فیصد تک زیادہ ہیں اور غیر ضروری نمود و نمائش مثلاً بیرونی سفر وغیرہ عام ہیں۔ یہ ادارے تعلقات عامہ کے شعبے رکھتے ہیں۔ انہیں حکومت کے وسائل ابلاغ کی سہولت حاصل ہے، اپنے ملازمین کو تعلیم و تربیت کے لئے بیرون ملک بھیج سکتے ہیں اور کانفرنسیں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اسلام آباد کی شاہراہ آئین پر سائنس کے نام پر تعمیر کی گئی بلند و بالا عمارت نظر آتی ہے جن پر اربوں روپے خرچ ہوئے ہیں۔ بظاہر تو یہ سب کچھ مصروف پیداواری اور موثر عمل کی علامت ہے لیکن کراچی میں ایک بہت کامیاب تحقیقی ادارہ کیمیا کے سوا دیگر سائنسی اداروں کی کارکردگی معقول معیار کے مطابق مایوس کن ہے اور ٹیکنالوجی کی ترقی نیز قومی معیشت پر اس کا اثر دکھائی نہیں دیتا۔ پاکستان کے نیوکلیائی پروگرام کو (جو دیگر مسلم ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے) قوم کی تکنیکی طاقت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اب تک اس کی واحد کامیابی جس کا اعلان کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس کے تحت کینیڈا کے بنائے ہوئے کراچی کے ری ایکٹر KANUPP کو چلایا جاتا ہے اور اس کے لئے ایندھن بنایا جاتا ہے۔ بھارت کے برعکس پاکستان اپنے طور پر پاور ری ایکٹر ڈیزائن کر کے بنانے کی توقع مستقبل قریب میں نہیں کر سکتا۔

پاکستان میں تحقیق و ترقی کی تنظیموں کے غیر موثر ہونے کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں۔ ان میں سے خاص سبب یہ ہے کہ امداد دینے والے بیرونی ادارے کھلی درآمدی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں دیسی ٹیکنالوجی ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ تنظیمی نااہلیت اور اعلیٰ مہارت رکھنے والے سائنس دانوں اور انجینئروں کی کمی ایک بڑا سبب ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سائنس اور انجینئرنگ کے مضامین میں Ph-D ڈگری یافتہ اشخاص کی کل تعداد کل پاکستان میں ایک ہزار کے لگ بھگ ہے جبکہ

بھارت میں ان کی تعداد ستر سے اسی ہزار تک ہے۔

اس صورت کے پیش نظر کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان فی کس آمدنی میں چنداں فرق نہیں ہے۔ سائنس کے شعبے میں کارکردگی کے اعتبار سے اتنے زیادہ فرق کیوں ہے؟ اس کا جواب تعلیمی نظام میں مضمر ہے۔

تعلیمی نظام میں سائنس کا مقام

سائنس کے شعبہ میں تحقیق و ترقی یا تنزلی کا تعلق لازمی طور پر تعلیمی نظام سے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی معاشرے کے فلسفہ حیات کا اظہار اس طریقے سے ہوتا ہے جو وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ نظام تعلیم وضع کرتے وقت اس سوال کا دو ٹوک جواب دینا ہوتا ہے کہ آیا ہم تعلیم کو معاشرے کے بدلنے اور جدید بنانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا اسے پرانی روایات اور طور طریقے برقرار رکھنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تعلیم کے مقاصد نوعیت، طریقوں وغیرہ پر ہم بعد میں بحث کریں گے اس وقت ہم مسلم ممالک میں تعلیم کی موجودہ وسعت کا سرسری جائزہ لیں گے۔ کچھ متعلقہ اعداد و شمار درج ذیل ہیں:

اعلیٰ کل	ثانوی		ابتدائی	
	عورت	مرد	عورت	مرد
5%	11%	24%	50%	69%
2%	17%	21%	41%	59%
5%	10%	25%	32%	55%
7%	34%	45%	116%	121%
21%	54%	77%	77%	96%
9%	27%	39%	62%	96%
10%	33%	56%	113%	121%
3%	27%	42%	92%	113%

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ امیر ممالک میں شرح تعلیم زیادہ ہوگی لیکن ایسا ضروری

نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شرح تعلیم سے تعلیم کے مقاصد، نوعیت اور معیار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

تمام مسلمان ملکوں کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں ہمارے پاس تفصیلی معلومات نہیں ہیں، اس لئے میں اپنی بات کو پاکستان تک ہی محدود رکھوں گا۔
ورلڈ بینک کی ایک حالیہ رپورٹ میں پاکستان کی تعلیمی حالت کا ایک صحیح مگر افسوس ناک نقشہ پیش کیا گیا ہے:

”پاکستان کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی خصوصاً عورتوں کی آبادی کی حصول تعلیم میں غیر معمولی پستی، ملک کی دور رس ترقی میں سنگین رکاوٹ ثابت ہوگی۔۔۔۔۔۔ انسانی وسائل کی وہ کمزور بنیاد جس پر ترقی کی عمارت تعمیر کی جا رہی ہے، اس کی نشوونما کے مستقبل کو آخرا کر خطرے میں ڈال دے گی اور اس ترقی کے فوائد کی تقسیم پر منفی اثرات مرتب کرے گی۔“

ساڑھے سات کروڑ پاکستانی نہ پڑھ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ پاکستان کی حکومت اوسط خواندگی کی شرح 34 فیصد بتاتی ہے جبکہ خواتین کی شرح خواندگی صرف 18 فیصد بتائی جاتی ہے۔ یہ شرح خواندگی تیسری دنیا کے معیار سے بھی پست ہے، حقیقی صورت حال اس سے بھی بدتر ہے۔ آزاد ذرائع کا اندازہ ہے کہ صحیح شرح سرکاری شرح کا ساٹھ یا ستر فیصد ہے۔ پاکستان کے ایشیائی ہمسایہ ملکوں میں تعلیمی اداروں میں داخلوں کا اوسط ستر سے نوے فیصد تک ہے۔ لیکن پاکستان میں ابتدائی درجوں میں شرکت کا درجہ صرف 55 فیصد ہے، جس میں سے پانچویں جماعت تک صرف 50 فیصد پہنچ پاتے ہیں۔ ثانوی جماعت تک یہ گھٹ کر 15 فیصد رہ جاتا ہے۔ پاکستان اپنے GNP (مجموعی قومی پیداوار) کا 1.9 فیصد (ایک اعشاریہ نو فیصد) تعلیم پر خرچ کرتا ہے جبکہ نیپال 2.4 فیصد، بھارت 2.6 فیصد اور انڈونیشیا 6.7 فیصد خرچ کرتے ہیں۔

بجٹ کا 6 فیصد پاکستان، 9 فیصد نیپال، 11.2 فیصد بھارت اور 26 فیصد ملائیشیا تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔ پاکستان کی حکومت نے کتابوں کے پڑھنے کی عادت اور کتابوں کی اشاعت کے متعلق ایک سروے کرایا تھا۔ اس مطالعہ کے نتیجے میں یہ معلوم ہوا کہ دونوں لحاظ سے پاکستان جنوبی ایشیا میں سب سے پیچھے ہے۔

پاکستان کی کسی بھی حکومت نے خواہ وہ فوجی ہو یا جمہوری، تعلیم کو کبھی بھی بہتر ترجیح نہیں دی۔ اس معاملہ میں جنرل ضیاء کی حکومت کا ریکارڈ سب سے خراب ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ایک تحقیقی ادارے نے، جس کو 1986ء میں حکومت نے تعلیمی حالت کے تجزیہ کا کام سپرد کیا تھا، جنرل ضیاء کی حکومت کے خلاف یہ فیصلہ صادر کیا ہے:

”سب سے زیادہ ڈرامائی فرق پانچویں پنج سالہ پلان کے منصوبوں اور حقیقی کارکردگی کے درمیان تھا۔ اس عرصہ (1978-83) میں کارکردگی منصوبے میں دیئے گئے ہدف سے پچاس فیصد کم رہی جو اس آزاد قوم کی تاریخ میں تعلیم کے لئے قومی کوشش کے کم ترین درجہ کا مظہر تھی۔“

اس سے قبل پاکستانی تاریخ کے ادوار میں تعلیم کے حصول کی پستی کو خاموش شرمندگی کے ساتھ تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں تعلیم کے مقاصد غیر شعوری طور پر آفاقی اور جدید تھے۔ لیکن 1977ء میں جنرل ضیاء الحق نے جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر فوجی حکومت قائم کرنے کے بعد بنیاد پرست جماعتوں سے اتحاد کیا اور آمرانہ حکومت کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ اب اسلامی معاشرہ کا قیام ہوگا اور صرف مذہب کی بنیاد پر پاکستان کی قومی شناخت کی جائے گی۔ اس مقصد کے حصول کا اہم ذریعہ نظام تعلیم تھا۔ چنانچہ سرکاری طور پر مندرجہ ذیل اقدامات کا حکم دیا گیا:

- ☆ علمی اداروں میں خواتین کے لئے چادر کا لازمی استعمال۔
- ☆ تعلیمی اوقات کے دوران نماز ظہر کی ادائیگی۔
- ☆ چھٹی جماعت سے عربی کی ثانوی زبان کی حیثیت سے لازمی تعلیم۔
- ☆ میٹرک کے لئے ناظرہ قرآن کی تعلیم۔
- ☆ خواندگی کی تعریف میں یہ تبدیلی کہ مذہبی معلومات رکھنے والے کو خواندہ سمجھا جائے۔
- ☆ مکتب اور مدرسوں کو باقاعدہ سکولوں کا درجہ دیا جائے۔
- ☆ مکتب کی سند کو ایم۔ اے کے برابر سمجھا جائے۔
- ☆ انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں داخلے کے ایسے امیدواروں کو بیس مزید نمبر دیئے جائیں گے جنہوں نے قرآن حفظ کیا ہو۔

☆ اسلام آباد میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کا قیام۔

☆ معاشرے کو اسلامی بنانے کے مختلف پہلوؤں پر کئی بین الاقوامی اور قومی کانفرنسوں کا

انعقاد۔

☆ سائنس اور دیگر مضامین کے لئے اساتذہ کا انتخاب اس معیار پر کرنا کہ وہ مذہبی معلومات رکھتے ہیں یا نہیں۔

☆ روایتی درسی مضامین کے نصاب پر اس مقصد سے نظر ثانی کہ نصابی کتب میں اسلامی اقدار پر زور دیا جائے۔

جنرل ضیاء الحق اور اس کے مقلدوں نے اسلامی تعلیم کے تصور کو نہایت سنجیدگی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ مندرجہ بالا احکام کی کچھ حد تک تعمیل کی گئی، لیکن جب طاقتور مفادات پر زد پڑنے کا سوال پیدا ہوا تو مذہبی جوش پر مصلحت کا ٹھنڈا پانی پڑنے لگا۔ مثال کے طور پر حکومت نے انگریزی ذریعہ تعلیم کے نجی اور مہنگے اسکولوں اور اداروں کو اسلامی تعلیم کے دائرے سے باہر رکھا کیونکہ ان میں فوجی افسروں، اعلیٰ نوکر شاہوں، بڑے بڑے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ کراچی گرامر اسکول، آکسیسن کالج، برن ہال، کیڈٹ کالج اور کئی دیگر تعلیمی ادارے اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ان کا مغربی تعلیمی معیار مغرب کے کسی بھی تعلیمی ادارے سے کم نہیں ہے۔

یہ تعلیمی ادارے (ان مدارس کے برعکس جن میں اردو زبان ذریعہ تعلیم ہے اور جو عوام کے لئے ہیں) آبادی کے تقریباً ایک فیصد کو جدید ادیسکولر (دنیاوی) تعلیم دیتے ہیں۔ تھوڑی بہت اور غیر اہم تبدیلیوں سے قطع نظر یہ تعلیمی ادارے ضیاء کے عہد میں اپنے پرانے نظام کے تحت حسب سابق کام کرتے رہے۔

جنرل ضیاء کی اسلامی تعلیم (جس سے اعلیٰ طبقہ کے تعلیمی ادارے محفوظ رہے) کے عمومی اثرات بہت وسیع اور گہرے ہیں۔ جدید دنیاوی تعلیم کی جگہ روایتی مذہبی تعلیم کے نفاذ نے ایسی تبدیلیاں پیدا کی ہیں جن کا اثر نسلیوں تک رہے گا۔ نوآبادیاتی عہد کے آغاز سے یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ جدید تعلیم سماجی ترقی کے لئے ضروری ہے نیز یہ کہ سماجی ترقی اچھی چیز ہے۔ لیکن 1977ء میں اس کی کھل کر مذمت کی گئی اور ماضی کی اسلامی شان و شوکت کے حصول کو مقصد

قرار دیا گیا۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے تمام جدید عمرانی مضامین اور قدرتی سائنسوں کو اسلامی بنانے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ اس مسئلہ پر بعد میں بحث کی جائے گی۔

اب ہم پاکستان میں سائنس کی تعلیم کے معیار اور نوعیت پر بحث کریں گے۔ یہ تعلیم عمومی طور پر سائنس کی روح کے مطابق نہیں ہے۔ مشہور کیمیا دان جے۔ بی۔ ایس ہیلڈین ایک واقعہ بیان کرتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں عام طور پر سائنس کس طریقے سے پڑھائی اور سکھی جاتی ہے

”ایک اتوار کی سہ پہر میں اپنے مکان کے قریب چہل قدمی کر رہا تھا کہ میں نے ایک مردانہ آواز یکساں سروں میں کچھ پڑھتے ہوئے سنی۔ میں نے سوچا کہ یہ شاید منتر پڑھنے کی آواز ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ یہ کیا پڑھا جا رہا ہے۔ لیکن میرے ساتھی نے بتایا کہ جس زبان میں پڑھا جا رہا ہے وہ انگریزی ہے اور اس کا مضمون نامیاتی کیمیا ہے۔ ہم لوٹے میرے ساتھی کا خیال صحیح تھا۔ پڑھنے کا مضمون مختلف احتیاطوں کے حوالہ سے Aliphatic Amines کی تیاری تھا۔“

ہارڈ کی وائڈ نر لائبریری کے دستاویز خانہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جو ولی محمد ذکی نامی ایک پاکستانی طالب علم نے 1964ء میں پیش کیا تھا۔ اس مقالے کا عنوان ہے۔ ”مذہب اور سائنس کی طرف سائنس کے پاکستانی اساتذہ کے رویے“۔ گو اس اہم شعبہ میں یہ غالباً واحد سنجیدہ کام ہے تاہم جہاں تک مجھے علم ہے، گزشتہ پچیس سال میں نہ تو اس مقالے کا حوالہ دیا گیا اور نہ ہی اس کے نتائج شائع کئے گئے۔ اپنے مقالے میں ذکی نے ایک سوالنامے کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغربی پاکستان میں ثانوی مدارس کے اساتذہ کس حد تک سائنسی کام کی نوعیت کو سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد وہ یہ طے کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ آیا ان کی سائنس کی تعلیم اور مذہب کی طرف ان کے رویہ کے درمیان کوئی تعلق ہے؟

ذکی کی تحقیق کے نتائج مندرجہ ذیل ہیں:

- 1- امریکہ میں ہائی اسکول کے طلباء و طالبات کی سائنسی سوجھ بوجھ۔ مغربی پاکستان کے ہائی اسکول کے اساتذہ سے خاصی بہتر تھی۔
- 2- جن اساتذہ کی تعلیم و تربیت پاکستان بننے کے بعد ہوئی، ان کا جھکاؤ مذہب کی طرف زیادہ

اور سائنس کی طرف کم تھا۔

3- سنی مسلمانوں کی بہ نسبت احمدیوں اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کا سائنس کی طرف زیادہ مثبت رویہ تھا۔

4- سندھ کے اساتذہ کا سائنس کی طرف رویہ زیادہ مناسب تھا۔

5- طبعی سائنسوں کے اساتذہ کی بہ نسبت سائنسی کام کی نوعیت ایسے اساتذہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں، جنہوں نے حیاتیات سے متعلق سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے۔

مندرجہ بالا مطالعے میں کئی نقائص ہیں۔ مثلاً یہ اہم اعتراضات کئے جاسکتے ہیں کہ جواب دینے والے انگریزی زبان میں اپنا مافی الضمیر اچھی طرح بیان نہیں کر سکتے تھے۔ ذکی کا تیار کردہ سوال نامہ بہتر طور پر تیار ہو سکتا تھا۔ لیکن کیا ان نقائص کی وجہ سے ہی ذکی کا مقالہ ناقابل توجہ رہا؟

1983ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائیکالوجی (NIP) نے چھٹی جماعت کے طلباء و طالبات کے سائنس اور ریاضی میں امتحانات لئے تاکہ پاکستانی طالب علموں کی لیاقت کا مقابلہ بیرونی طالب علموں کی لیاقت سے کیا جاسکے۔ جب NIP کے کارکنوں نے اس امتحان کو مقامی حالات سے ہم آہنگ کر لیا تو انہوں نے راولپنڈی کے تقریباً 420 طالب علموں کا امتحان لیا۔ چھٹی جماعت کے نتائج کا تقابل چونکہ اطمینان بخش نہیں تھا، اس لئے ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں (ایف۔ ایس۔ سی سال اول) جماعتوں کے امتحانات لئے گئے۔ چند نتائج مندرجہ ذیل گوشواروں میں ملاحظہ فرمائیے:

خاکہ نمبر 1: ریاضی اور سائنس میں چھٹی جماعت کے پاکستانی بچوں کا سمندر پار بچوں سے تقابل:

ریاضی کا امتحان

15.65

پاکستان

25.3

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

31.8

سویٹزرلینڈ

33.2	فرانس
35.8	کینیڈا
37.8	انگلینڈ
37.9	آسٹریلیا
37.7	سویڈن
50.2	جاپان

سائنس کا امتحان

30.0	پاکستان
41.3	سویٹزرلینڈ
42.1	فرانس
34.7	ریاست ہائے متحدہ امریکہ
45.2	جاپان
49-2	کینیڈا
49.2	آسٹریلیا
54.5	انگلینڈ
55.5	سویڈن

NIP کے محققوں نے جو خاص خاص نتائج اخذ کئے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

1- سمندر پار ملکوں کی چھٹی کلاس کے جس طالب علم نے سب سے کم نمبر حاصل کئے وہ بھی پاکستان کی چھٹی ساتویں آٹھویں اور نویں کلاس کے اعلیٰ ترین نمبروں سے زیادہ تھے۔ ریاضی میں جاپان کی چھٹی کلاس کے طالب علموں کے سب سے زیادہ نمبر (50.2) پاکستان کی گیارہویں جماعت کے طالب علموں کے سب سے زیادہ نمبروں (38.80) سے زیادہ

تھے۔ رپورٹ یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ ہماری گیارہویں جماعت کے طالب علم بھی سائنس اور ریاضی میں دیگر ملکوں کی چھٹی جماعت کے طالب علموں سے کمتر ہیں۔

2- ایک سے دوسری کلاس میں ترقی پانے والے طالب علموں کی استدلالی اہلیت کی شرح ارتقا بہت آہستہ ہے۔ رپورٹ کے مطابق ”نہایت معنی خیز چیز یہ ہے کہ سیکھنے (اکتساب علم) کی رفتار بہت زیادہ سست ہے۔ متوسط دور کی تدریس کے تین سالوں میں (یعنی چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک) سائنس اور ریاضی کی معلومات میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہوتا۔“

3- یہ خیال عام ہے کہ انگریزی میڈیم سکول اردو میڈیم سکول سے بہتر ہوتے ہیں۔ لیکن NIP کی رپورٹ کے مطابق سائنس اور ریاضی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں بلکہ اردو میڈیم سکولوں کے نتائج اس امتحان میں کسی حد تک بہتر تھے۔

29 جنوری 1986ء کو اسلام آباد کے Center of Basic Sciences (بنیادی سائنسوں کے مرکز) نے نوبیل انعام یافتہ عالم طبیعیات سموئیل ٹنگ کا ترتیب دیا ہوا امتحان لیا۔ اس امتحان میں تمام پاکستان سے بلائے گئے تقریباً 120 امیدواروں نے شرکت کی۔ ان کی تعلیمی لیاقت ایم۔ ایس۔ سی ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی تک تھی۔ انہیں اپنے ساتھ نوٹس اور کتابیں تک لانے اور امتحان کے دوران ان سے حوالے لینے کی اجازت تھی۔ امتحان کا دورانیہ پانچ گھنٹے تھا۔ پرچہ میں طبیعیات کے مختلف موضوعات پر دو سو کثیر الانتخاب سوالات تھے کیونکہ ہر سوال کے تین جوابات تھے۔ قیاس آرائی کے ذریعہ جواب دینے سے بھی 67 نمبروں کا اوسط حاصل ہو سکتا تھا۔ جو امیدوار پاس ہونے کے لئے ضروری 160 نمبر حاصل کرتے، انہیں MIT میں داخلہ مل سکتا تھا۔

لیکن ایک بھی امیدوار پاس نہیں ہوا۔ کسی نے پاس ہونے کے لئے ضروری نمبروں کے قریب تر بھی نمبر حاصل نہیں کئے۔ سب سے زیادہ نمبر 113 تھے، حاصل کئے گئے نمبروں کا اوسط 70 تھا۔ یہ صرف تین نمبر اس اوسط سے زیادہ تھا جو کوئی بھی اندازے سے نشان لگا کر حاصل کر سکتا تھا۔ ارباب اختیار نے امتحان کے نتائج کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن آخر کار راز افشا ہو گیا۔

بہت ہی ابتدائی مواد کو بھی اپنی داخلی ذہنی مشین کا حصہ نہیں بناتی۔ 1985ء سے پاکستان وزارت برائے سائنس و ٹیکنالوجی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے کئی سو طالب علموں کو امریکہ اور برطانیہ بھیجتی ہے۔ چنے جانے والے افراد کہنے کو تو اس ملک کے بہترین طلباء میں سے ہوتے ہیں اور ہر ایسے طالب علم پر تیس سے پینتیس ہزار امریکی ڈالر کا خرچہ ہوتا ہے۔ لیکن اس منصوبہ سے کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کیونکہ طالب علموں کی اکثریت پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل نہیں کر سکی۔ مثال کے طور پر 1985-86 کے دوران 187 طالب علموں کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے امریکہ بھیجا گیا تھا۔ لیکن ان میں سے بالآخر فقط 21 افراد ڈگری مکمل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ 51 کو ایم۔ ایس۔ سی کی ڈگریاں ملیں۔

برطانیہ سے پی۔ ایچ۔ ڈی حاصل کرنے والوں کی شرح بہتر ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کا معیار تعلیم امریکہ کی نسبت کم ہے۔

امتحانی پرچوں میں دیئے جانے والے سوالات کے لگے بندھے نمونوں کو باعث یہ ہوا ہے کہ بے شمار ’کوچنگ سینٹر‘ کھل چکے ہیں جو طالب علم سے ایک ٹھیکہ داری معاہدہ کرتے ہیں جس کے تحت یہ ضمانت دی جاتی ہے کہ ایک خاص رقم کے عوض اور ایک خاص عرصہ تک مرکز میں پڑھائی کے بعد طالب علم امتحان میں مخصوص درجہ تک کے نمبر حاصل کر سکے گا۔ پاکستانی اخبارات وقتاً فوقتاً ڈگریوں، شہرکیٹ اور مارکس شیٹ کی فروخت نیز امتحانات میں نقل وغیرہ کے متعلق انکشافات کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کی بے ایمانیوں اور دھاندلیوں کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ تاہم چونکہ ان کے متعلق سچی جانتے ہیں۔ نیز محنتی اور ایماندار طالب علموں کی ان باتوں سے حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور وہ بھی امتحانات میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے با معنی محنت نہیں کرتے۔

تعلیمی ترجیحات میں بنیادی تبدیلیوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دنیاوی علوم کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور ان کے حصول میں کارکردگی کا معیار بھی پست ہو گیا ہے۔ مذہبی اور قومی نظریہ پرستی پر زور کی وجہ سے ادب پاروں کی جگہ اخلاقی مضامین اور کلاسیکی شاعری کی بجائے مذہبی شاعری پڑھائی جانے لگی ہے۔ تاریخ و جغرافیہ کی پڑھائی مسلمانوں کے تاریخی ادوار اور مسلم علاقوں تک محدود ہے۔ دنیا کی آفاقی تہذیب کے تصور سے لوگ نا آشنا ہیں۔ سب سے اہم بات یہ

ہے کہ علم کے حصول میں عقل اور تخلیقی صلاحیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ تعلیم میں نظریات کی بے انتہا دخل اندازی کی پالیسی کو احتجاج یا اختلاف کے ذریعہ چیلنج نہیں کیا گیا۔ اس کے بجائے ایسے والدین جو اضافی اخراجات برداشت کر سکتے ہیں اپنے بچوں کو انگریزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ ان اسکولوں میں دنیاوی علوم زیادہ پڑھائے جاتے ہیں اور یہ بیرون ممالک کی چھپی ہوئی نصابی کتب پڑھاتے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر تعلیم کو اسلامیانے کی پالیسی کے باعث نجی تعلیمی اداروں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ ان اداروں نے جنرل ضیاء کے پاکستان میں نظریہ پرستی سے فرار چاہنے والوں کو پناہ فراہم کی۔ جنرل ضیاء کے بعد جو حکومتیں آئی ہیں۔ وہ اتنی کمزور ثابت ہوئی ہیں کہ تعلیمی نظام میں کوئی معنی خیز تبدیلی نہیں کر سکیں۔

جنرل ضیاء کے عہد حکومت میں پاکستانی یونیورسٹیوں میں علم و دانش کی کارکردگی بہت کم ہو گئی۔ عام لیکچروں، مباحثوں، ڈراموں، موسیقی کی محفلوں اور مشاعروں تک سے دانش گاہوں کے احاطے محروم ہو گئے۔ یہ کچھ تو اس سبب سے ہوا کہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے اپنے اعصاب پر بدامنی کے خوف کا ہوا سوار کر رکھا تھا اور کچھ اس وجہ سے کہ طالب علموں کے مذہبی گردہ ڈرامے اور موسیقی کو غیر اسلامی سمجھتے تھے اور دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ یہ دوسرا عنصر ضیاء کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔

جنوبی ایشیا میں پاکستانی یونیورسٹیوں کا شمار گھٹیا تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے کیونکہ ان میں بہت کم نئی تحقیق ہوتی ہے اور یہاں کوئی نئی سوچ یا فکر جنم نہیں لے پاتی ہے۔

بھارتی یونیورسٹیوں کا تقابل پاکستانی یونیورسٹیوں سے کیجئے۔ یہ تقابل اس لئے جائز ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان واضح تاریخی اور ثقافتی مماثلت ہے۔

بھارت میں طبعیاتی سائنسوں اور انجینئرنگ کے ایک درجن سے زیادہ ادارے موجود ہیں۔ ان میں پانچ ٹیکنالوجی کے ادارے بھابھا اٹاک انرجی سینٹر، ٹانا انسٹی ٹیوٹ آف فنڈامینٹل ریسرچ، ساہا انسٹی ٹیوٹ، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے ایک کانپور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کا تعلیمی اور تحقیقی ماحصل ہی پاکستان کے تمام اداروں کے مجموعی ماحصل سے زیادہ ہے۔ 1982ء سے 1985ء کے دوران پی۔ ایچ۔ ڈی

کی کل 7 ڈگریاں؛ جن میں سے زیادہ تر حیاتیات کے مضامین میں تھیں۔ پاکستان یونیورسٹیوں سے دی گئیں۔ انجینئرنگ میں ایک بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہیں دی گئی۔ اس عرصہ میں کانپور کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی نے سائنس اور انجینئرنگ میں 302 پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دیں۔ 1980ء میں بھارت میں سائنس کے مضامین میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی کل 2000 سے زیادہ ڈگریاں دی گئیں۔

پاکستان میں دانشوری کے فقدان کی وجہ سے ذہین و فطین نوجوان؛ جن کی بیرونی ملکوں میں اپنے اپنے شعبہ ہائے علم میں بڑی شہرت ہے؛ پاکستانی یونیورسٹیوں میں کام کرنے سے کتراتے ہیں۔ تاہم کبھی کوئی جوان دانشور قائل ہو کر پاکستانی دانش کدوں میں داخل ہونے کا خطرہ مول لے لے تو زیادہ تر امکان یہ ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار اور سلیکشن بورڈ سے اس کا نباہ نہیں ہوگا۔

ارباب اقتدار نے ناپسندیدہ تبدیلی سے یونیورسٹی کو محفوظ رکھنے کے مقصد سے ایک خاص نظام قائم کیا ہے۔ اساتذہ کے انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ دانشوری اور پیشہ وارانہ اہلیت کے جراثیم سے پاک ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی سلیکشن بورڈوں کو جو سب سے اہم کام تفویض کیا گیا ہے وہ دانشوری کی ”گندگی“ سے یونیورسٹی کو محفوظ رکھنا ہے۔۔۔۔۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں ان میں دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی شامل ہے کہ امیدوار سے اس کے مضمون سے باہر ایسے سوالات کئے جائیں جن کا اس کی پیشہ وارانہ قابلیت اور اہلیت سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس دعوے کی تصدیق اور تشریح ملک کے بہترین تعلیمی ادارے ”قائد اعظم یونیورسٹی“ کے سلیکشن بورڈ کی 1987ء اور 1988ء کی رپورٹوں سے ہوتی ہے۔ جو امیدوار بورڈ کے سامنے پیش ہوئے ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کے پاس سائنس کے مضامین میں بہترین پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں تھیں اور جو ہر طرح سے اہل تھے۔ لیکن مضمون سے متعلق سوالات کے بجائے مندرجہ ذیل سوالات تمام امیدواروں سے پوچھے گئے:

☆ حضور اکرم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواج مطہرات کے نام بتائیے؟

☆ دعائے قنوت سنائیے؟

☆ قرارداد پاکستان کب پیش کی گئی؟

☆ مختلف اذانوں میں کیا فرق ہے؟

☆ آپ کے (امیدوار کے) نام کا کیا مطلب ہے؟

☆ اللہ تعالیٰ کے مختلف اسماء الحسنی بتائیے؟

صدر ضیاء کے عہد میں امیدواروں سے اسلام اور پاکستان کے متعلق سوالات کرنا سرکاری پالیسی کا حصہ تھا۔ ایسے سوالات کے جواب دینے سے انکار کرنے والے امیدواروں کو عموماً مسٹر کر دیا جاتا تھا۔ چاہے وہ اپنے مضمون میں کتنا ہی ماہر کیوں نہ ہو۔

یہ مسئلہ کہ یونیورسٹی کے اساتذہ سے کیا توقع کرنی چاہیے، دراصل معاشرے میں یونیورسٹی کے دیئے گئے فرائض سے منسلک ہے۔ فعال اور ترقی پسند معاشروں میں یونیورسٹیاں وہ مقناطیس ہوتی ہیں، جن کی طرف بہترین تخلیقی دماغ کھنچے چلے آتے ہیں۔ وہ نہ صرف آئندہ نسلوں کو علم دیتے ہیں بلکہ علم کو وسعت بھی فراہم کرتے ہیں اور معاشرے کو وہ ذہنی تحریک دیتے ہیں جو علم کی نشوونما کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ جدید معاشرہ یونیورسٹیوں کی طاقت اور قوت پر خصوصاً انحصار کرتا ہے۔ ان کے بغیر سوسائٹی غیر متحرک اور سست روی کا شکار ہو جاتی ہے۔

پاکستانی معاشرے نے اپنی یونیورسٹیوں میں صرف اطاعت پسندی کو پروان چڑھایا ہے۔ یونیورسٹیوں کے احاطوں میں کلائٹونوں اور خود کار اسلحہ کا استعمال عام ہوتا جا رہا ہے۔ تابع داری کے باعث طلباء میں آزادانہ سوچ کی صلاحیت سلب ہو گئی ہے۔ ان میں تجزیہ و تخلیق کی اہلیت نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی یونیورسٹی ایک ایسا مرکز بن گئی ہے جس پر معاشرے کے کم قابلیت والے ارکان۔۔۔۔۔ یعنی وہ اساتذہ اور طلباء جو دوسرے شعبوں میں کام کے اہل نہیں ہیں۔۔۔۔۔ جمع ہونے کا رجحان رکھتے ہیں۔ اس جگہ تشدد ایک قدرتی اور ناگزیر عمل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں اظہار خیال کی ممانعت ہو اور مطلق حق یا مطلق باطل کے تصورات کا راج ہو۔

سائنس کا صحیح نظر

جب ٹیکنالوجی کی سرحدوں کی چھان پھٹک کی جائے تو سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان فرق دھندلا ہوتا جاتا ہے۔ جنیٹک انجینئرنگ، روبوٹ اور مصنوعی ذہانت کا نظام، کمپیوٹر، نیوکلیائی

توانائی، خلائی سفر وغیرہ اعلیٰ سائنس کے ذریعے وجود میں آئے اور ان کی مزید ترقی کا انحصار خالص سائنس پر ہی ہے۔ تاہم سائنس اور ٹیکنالوجی کو مترادف سمجھنا یا متبادل خیال کرنا غلط ہوگا۔ ان کے مقاصد مختلف ہیں اور فلسفیانہ نیز نظریاتی سطحوں پر ان کے تقاضے بھی مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر تیل صاف کرنے کے کارخانے یا موٹر بنانے کے کارخانے کا خاکہ (ڈیزائن) بنانے اور تعمیر کرنے میں اقدار یا عقائد پر کوئی اثر نہیں پڑتا جبکہ سائنس کے نظریات کا عقائد پر اثر پڑ سکتا ہے۔ سائنس کے لئے تحقیق و تفتیش لازمی ہے اس لئے روایتی انداز فکر سے اس کا ٹکراؤ بھی ناگزیر ہے۔

ہم نے سائنس سے سعودی حکام کی گھبراہٹ کا تذکرہ کیا ہے۔ سائنس کے نظریہ کائنات اور ایمان کے تقاضوں کے درمیان ٹکراؤ سے ان کی گھبراہٹ نئی نہیں ہے۔ اس کا اظہار بہت پہلے تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ کر چکے ہیں۔ میں اس باب کے بقیہ حصے میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ موجودہ عہد کے کئی مسلم ملکوں میں آزادی فکر اور سائنس کے لئے آب و ہوا کیوں سازگار نہیں ہے۔

کہیں اور معجزات پر سائنسی سوچ اور روایتی فکر کے درمیان تنازعہ اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ مسلم ممالک میں ہے۔ معجزات کے وجود اور ان کے اثر پر اعتقاد کی اہمیت جتانے کے لئے ہی ”قرآن و سنت کے سائنسی معجزات“ کے زیر عنوان ایک کانفرنس اکتوبر 1987ء میں اسلام آباد میں بڑے پیمانے پر منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کا افتتاح پاکستان کے سابق صدر ضیاء الحق نے کیا۔ یہ کانفرنس بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور مکہ کی ”سائنسی معجزات کی تنظیم“ نے مشترکہ طور پر بلائی تھی اور اس میں کئی مسلم ملکوں کے سینکڑوں مذہبی علماء اور سائنس دانوں نے شرکت کی تھی۔ ”سائنسی معجزات“ کی کانفرنس کا انعقاد اس لئے قابل ذکر ہے کہ یہ ایسی کئی کانفرنسوں میں سے ایک تھی جن کو حکومت پاکستان نے ماضی قریب میں منعقد کرایا تھا۔ ان کانفرنسوں سے پاکستان میں اس وقت کے ارباب اختیار کی سوچ اور ارادوں کا پتہ لگتا ہے۔

سائنسی معجزات کی کانفرنس کا زور مندرجہ ذیل نکات پر تھا:

1- سائنسی معجزات کے وجود کا اثبات۔

2- یہ ثابت کرنا کہ تمام معلوم سائنسی حقائق قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔

3- طبعی طریقہ ہائے عمل کے متعلق مقدس صحیفوں کے متن پر مبنی نئی قیاس آرائیاں۔

4- دنیاوی، مغربی سائنس کی مذمت۔

اس کتاب کے ایک باب میں ان چند مقالوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا جو اس کانفرنس میں پیش کئے گئے تھے۔

رمضان کا نیا چاند ایک ایسا موضوع ہے جس پر علماء اور سائنسی رجحان رکھنے والوں کے درمیان نیز خود علماء کے مابین تلخ بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ سائنسدان اس بات کی سچائی پر اصرار کرتے ہیں کہ جدید علم فلکیات کے تحت نئے چاند کے مقام اور وقت کا ٹھیک ٹھیک تعین ممکن ہے، اس لئے ان کی رائے میں مختلف دیکھنے والوں کے درمیان اختلافات سائنسی مشاہدے کے ذریعہ دور کئے جاسکتے ہیں اور عید کی تاریخ کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ لیکن زیادہ تر علماء سائنس دانوں کی اس رائے کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آنکھ سے دیکھ کر ہی یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ نیا چاند ہو گیا ہے۔ اس نازک مسئلہ پر پھوٹ اور فساد کے امکان کو رد کرنے کے لئے پاکستان کی حکومت نے رویت ہلال کمیٹی مقرر کی ہے۔ اس کمیٹی کے ارکان وقت آنے پر چاند دیکھنے کے لئے ہوائی جہاز میں اوپر جاتے ہیں۔ اس طریق کار پر بھی علماء میں اتفاق نہیں ہے۔

ایک اور مسئلہ موسمی پیش گوئی کا ہے جس پر کٹر علماء اور جدید نظریات کے حامل لوگوں میں اختلاف ہے۔ زیادہ تر مسلم ممالک کی حکومتیں جدید شعبہ موسمیات رکھتی ہیں۔ جو موسمی مصنوعی سیاروں کے فراہم کردہ حقائق اور دقیق طبیعیات حساب کی رو سے موسمی تبدیلیوں اور بارش کی پیش گوئی کرتا ہے۔ موسمی پیش گوئیاں سرکاری ذرائع ابلاغ سے نشر کی جاتی ہیں۔ لیکن کٹر مذہبی علماء ناخوش ہیں کیونکہ ان کے نزدیک بارش کی پیش گوئی انسان کے علم کی جائز حدود سے باہر ہے اس لئے مشیت ایزدی کے دائرہ اختیار میں دخل اندازی کے مترادف ہے۔ چنانچہ 1983ء اور 1984ء کے درمیان موسمی پیش گوئیوں کے اعلانات خاموشی سے معطل کر دیئے گئے لیکن بعد میں پھر جاری کر دیئے گئے۔ تاہم سرکاری سطح پر یہ یقین قائم رہا کہ موسموں کی تبدیلی میں مافوق الفطرت طاقت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس لئے جب بھی خشک سالی پڑتی ہے سعودی عرب کی حکومت بارش کے لئے خصوصی نمازوں کا اہتمام کرتی ہے اور 1981ء کے

بعد پاکستان میں جنرل ضیاء کی حکومت نے بھی ایسی خصوصی نمازیں پڑھوائیں اور ان نمازوں میں مسلمان کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ ایسی نماز کو نماز استنقاء کہتے ہیں۔

موجودہ دور میں بھی مسلم یونیورسٹیوں کے روایتی نصاب تعلیم میں بطلموسی فلکیات شامل ہے جو زمین کی مرکزیت پر مبنی ہے۔ جدید فلکیات کو بھی نصاب میں شامل کیا گیا ہے لیکن اسے صرف ایک ”مفروضے“ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ شیخ عبدالعزیز بن باز جو مدینہ یونیورسٹی کے صدر ہیں اور جن کو 1982ء میں ”خدمت اسلام“ کا شاہ فیصل عالمی انعام بھی دیا گیا ہے، بطلموسی نظام فلکیات پر یقین رکھتے ہیں۔ 1982ء میں شیخ عبدالعزیز ابن باز نے ”جریان الشمس والقمر والسکون الارض“ کے عنوان سے عربی میں ایک کتاب تصنیف کی۔ اردو میں اس کتاب کا ترجمہ یہ ہے: ”شمس و قمر کی حرکت اور زمین کا سکون“۔ بزرگ شیخ کہتے ہیں کہ زمین کائنات کا محور ہے اور سورج اس کے گرد گھومتا ہے۔ اس سے پہلے کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں شیخ نے دھمکی دی تھی کہ اس نظریے پر اعتقاد نہ رکھنے والوں کے خلاف تکفیر کا فتویٰ جاری کیا جائے گا لیکن زیر بحث کتاب میں یہ دھمکی نہیں دہرائی ہے۔ شیخ باز سعودی عرب کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ان کے نظریات کو سعودی عرب میں بہت وقعت حاصل ہے۔ اس لئے بعض قاری یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس ملک میں سائنسی ترقی کو خوبی نہیں سمجھا جاتا، لیکن سعودی عرب پہلا اور اب تک واحد مسلم ملک ہے جس نے اپنے ایک خلا نورد کو خلا میں بھیجا ہے۔ ناسا (NASA) کی خلائی گاڑی میں سفر کرنے والا خلا باز اگر نماز کے لئے قبلے کا تعین کرنے میں مصروف نہ ہوتا تو یقیناً شیخ باز کے نظریہ نجوم پر کوئی تبصرہ کرتا۔

روایتی مسلم علماء جدید نیوکلیائی نظریے سے ہنوز بے خبر ہیں اور اس نظریے پر سختی سے قائم ہیں کہ خاک، آتش، آب اور باد ہی مادے کے عناصر ہیں۔ یہ نظریہ ہی ان کی عمومی فلسفیانہ مویشگافیوں کی بنیاد ہوتا ہے اور اکثر جمعہ کی نماز کے خطبوں میں سنا جا سکتا ہے۔ یہ عالمانہ تقریروں اور مباحثوں کا موضوع بھی ہوتا ہے۔ اس موضوع پر کئی شائع شدہ کتابوں میں سے ہم مولانا قاری محمد طیب کی کتاب کا حوالہ دیں گے۔ اس جید عالم نے اپنی کتاب میں مندرجہ ذیل مسائل سے بحث کی ہے۔

1- طاقت آتش بمقالہ قوت آہن۔

2- زمین کے مقابلہ میں پانی کی پاکیزگی یا صفائی۔
3- ہوا کی فضیلت۔

مندرجہ بالا موضوعات پر بحث سے شاید زمانہ قدیمہ کے یونانی مرعوب ہو جاتے لیکن چار ہزار سال بعد مولانا کے خیالات سائنس دانوں کے لئے بے وقت کی راگنی ہیں۔
گو یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس نے اوہام پرستی پر فتح حاصل کر لی ہے، لیکن مسلم ملکوں میں سائنس کو اب تک مکمل فتح حاصل نہیں ہوئی ہے اور کبھی کبھی اس کے بہت المناک نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کراچی میں فروری 1983ء کے مشہور ہاکس بے واقعے کو ہی لیجئے۔ موسم سرما کی ایک صبح ضلع چکوال کے سینکڑوں دیہاتی گاؤں کی ایک دو شیزہ کے خواب سے متاثر ہو کر بحر عرب میں کود پڑے۔ انہیں امید تھی کہ وہ سمندر پار کر بلائے مقدس پہنچ جائیں گے اور انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ سمندر ان کو حفاظت سے منزل مقصود تک پہنچا دے گا۔ تیس سے زائد لاشوں کو سمندر سے نکالا گیا۔ پولیس کو معلوم نہیں تھا کہ اس عجیب و غریب معاملے سے کیونکر بچا جائے۔ چنانچہ اس نے خالص افسر شاہی انداز اختیار کیا۔ جو لوگ مرنے سے بچ گئے تھے ان کو اس الزام کے تحت حراست میں لے لیا گیا کہ وہ پاسپورٹ کے بغیر ملک چھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن انہیں جلد ہی چھوڑ دیا گیا۔ بعض با اثر علماء نے زیارت کی اس ناکام کوشش کو سراہا۔ اس کے بعد چندہ جمع کر کے بچنے والوں کو بذریعہ ہوائی جہاز زیارت کے لئے بھیجا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ اس بد نصیب مہم کی عمومی طور پر حمایت کی گئی اور تعریف کی گئی۔

باب پانچ

پسماندگی کے اسباب، مسلمانوں کے تین تجزیے

”موجودہ شکل میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے اسلام میں کوئی ترقی نہیں کی۔ یہ حقیقت جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے زوال کی علامت نہیں بلکہ علم کی ہر شکل کو خالص دنیاوی تسلیم کرنے سے اسلام کا انکار ہے۔“

(سید حسین نصر)

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ کئی مسلم ملکوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نہایت سست رفتار ہے۔ اس بات کو پچھلے باب میں کچھ تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور ثبوت میں صنعتی پیداوار، سائنسی تحقیق، تعلیم اور ترقی کی دیگر روایتی علامت کے متعلق حقائق اور اعداد و شمار بھی دیئے گئے ہیں۔

اس لئے ایک تلخ حقیقت سے چشم پوشی کرنے کی بجائے یہ کہیں زیادہ مفید ہوگا کہ ہم یہ جاننے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ مسلم ممالک میں سائنس اور جدید ترقی کی رفتار دوسرے ملکوں کی بہ نسبت زیادہ سست کیوں ہے۔

سادہ اور آسان ترین جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ سائنسی پسماندگی کی ذمہ داری مذہب اسلام پر عائد کر دی جائے۔ مغرب میں عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام کے سخت اور بے لچک عقائد ہی مسلم ممالک کی پسماندگی کا سبب ہیں اور یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام جدید سائنسی ثقافت سے ہم آہنگ نہیں۔ مغرب کے کئی مستشرقین، خصوصاً وہ جو سامراج کی بلند اخلاقیات کی مسند پر بیٹھ کر مسلم مشرق کا مطالعہ کرتے ہیں، عرصے سے مصر ہیں کہ اسلام انسان کو تقدیر پرست بناتا

ہے، مستقبل کے بجائے ماضی کی طرف لے جاتا ہے اور نئے تجربات اور جدت کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اکثر اسلام کی بے شمار تفسیروں کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کئے بغیر وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ بنیادی طور پر جدید تمدن اور اسلام کے درمیان ایک تضاد ہے کیونکہ دنیا و آخرت کی اقلیموں کے درمیان سرحد بہت مبہم ہے، نیز اسلام اور جدید تمدن کے متعلق بعض ممتاز مستشرقین کے خیالات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ ڈینیئل لرنز مغرب کے ایک ممتاز عالم عمرانیات نے کہا کہ ”اسلام کے پاس جدید تمدن کے خلاف قطعاً کوئی دفاع نہیں ہے۔“

☆ مین فریڈ ہیلر کے بقول: ”وہ اسلامی نظام جس نے کسی زمانے میں انسان، خدا اور معاشرے کے درمیان تعلق قائم کیا تھا، اب جدید تمدن کے حملوں سے منتشر ہو رہا ہے اور جدیدیت کی آمد سے اس کا توازن کا بگڑ جانا ناگزیر ہے۔“

☆ مستشرق ٹالکوٹ پارن کے خیال میں اسلام خود کو جدید اور آفاقی نظام کی صورت میں تبدیل نہیں کر سکا۔ وہ اس ناکامی کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کرتا ہے۔

1- مسلم آبادیوں میں مشتمل مسلم امہ کسی ایسے مرکز کی تشکیل نہیں کر سکی جس کے پاس تمام قانونی، انتظامی اور اخلاقی ضوابط کا اختیار ہو۔

2- سیاسی طور پر اپنے زیر تسلط آبادیوں کی بڑی اکثریت کو مسلمان بنانے میں اسلام کی ناکامی جیسا کہ (عموماً پس ماندہ یا غیر مہذب آبادیوں میں) عیسائیت نے کیا تھا۔

3- یونان کے عقلی تمدن کا قبول نہ کرنا۔

4- مذہبی روایات مثلاً مروجہ خیالات و عادات کی تقلید کو عین اخلاقی روایت سمجھنا اور اس کا ارتقا کی راہ میں رکاوٹ بننا۔

5- اسلامی قانون کے کسی ٹھوس شکل میں مرتب نہ ہونے کی وجہ سے ابہام کا موجود رہنا۔

6- مذہبیات اور قانون کے لئے فلسفیانہ بنیاد کا فقدان۔

7- مادی دنیا اور مابعد الموت دنیا میں واضح حد بندی نہ ہونا اور اس لئے ان فکری اور علمی روایات کا جنم نہ لینا جن کی بدولت یہ ایک آفاقی اور ہمہ گیر معاشرہ بن سکتا۔

جرمن عالم عمرانیات میکس ویبر، ایک ایسا با اثر دانشور تھا جو اپنے نسلی تعصبات کے اظہار میں

عامحسوس نہیں کرتا تھا۔ اس کی ایک خاص دلیل یہ تھی کہ جنگجو لوگوں کے مذہب کی حیثیت سے اسلام نے ایسی اخلاقیات کو رواج دیا جو بنیادی طور پر عقلی سرمایہ دارانہ سوسائٹی کی اخلاقیات سے مطابقت نہیں رکھتی اور جس کے بغیر معاشرہ ازمندہ وسطی سے باہر نہیں نکل پاتا۔ میکس ویبر کے نظریات اور تجزیے پر بعد میں بحث کی جائے گی۔

ہم یہاں مستشرقیت کے عنوان سے اس کی عمومی حیثیت میں بحث نہیں کریں گے، دیگر مصنفین مثلاً ایڈورڈ سعید نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور ایسے مطالعے کی بے رحمانہ فطرت کو بے نقاب کیا ہے جس میں زیر مطالعہ موضوع کے سلسلہ میں غیر جانبداری کا فقدان ہوتا ہے۔ مستشرقین زیادہ تر پس ماندہ مسلمان کے ناقابل تغیر نمونے کی تصویر کشی کرتے رہے ہیں کیونکہ انہوں نے محض رسمی اور متن کی بنیادوں پر اسلام کے متعلق نظریات قائم کئے ہیں اور ان تمام مختلف عقلی میلانات و تحریکات کو فروعی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے جو مسلم تہذیب و تمدن کے تاریخی ادوار میں بیک وقت موجود رہے ہیں۔ اس ضمن میں صرف حقائق کا جھٹلانا ہی وجہ اعتراض نہیں ہے۔ ایک اور سبب یہ ہے کہ حیات انسانی کے ایسے میدان میں جہاں سختی سے سائنسی معروضیات کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ جوڑ توڑ کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ زیادہ تر مستشرقین کی تصنیفات میں اپنے موضوع مطالعہ کے خلاف عموماً خفیہ نفسیاتی بغض پایا جاتا ہے۔ مشہور اسلامی مستشرق، منگمری واٹ نے اس بات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

”مشکل یہ ہے کہ ہمیں ایک گہرا تعصب و ریشہ میں ملا ہے جس کی جڑیں ازمندہ وسطی کے ”جنگی پروپیگنڈہ“ میں پائی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ تقریباً آٹھویں صدی عیسوی سے یورپ نے اسلام کو اپنے ایک بڑے دشمن کی حیثیت سے جانا۔ یہ دشمن اس کے لئے فوجی اور روحانی دونوں ہی شعبوں کے لئے خطرہ تھا۔۔۔۔۔۔ بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں اسلام کے متعلق یورپی ذہن میں جو تصور پیدا کیا گیا، وہ عرصہ دراز تک غالب رہا اور اس کے اثر کی باقیات بیسویں صدی تک پائی جاتی ہیں۔ اس تصور کے مطابق اسلام عیسائی صداقتوں کی ایک مسخ شدہ شکل بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ بت پرستانہ مذہب ہے، یہ تشدد کا مذہب ہے جو بزور شمشیر پھیلا یا گیا، یہ ایسا مذہب ہے جس میں رہبانیت نہیں ہے۔“

اس قسم کے تعصب اور عناد کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں میں مدافعانہ رد عمل پیدا ہوا ہے اور وہ ہر تنقید کو بد نیتی، تعصب یا عناد پر محمول کرتے ہیں۔ اس کے سبب ان کے ذہن کے دروازے بند ہو گئے ہیں اور اس بحران کی شدت کا اندازہ نہیں لگایا جا رہا جس میں آج مسلم دنیا گھری ہوئی ہے۔

یہ تسلیم کہ ”بحران“ کا لفظ کچھ زیادہ ہی استعمال کیا جا رہا ہے، لیکن آج کے مسلم ممالک کے ضمن میں اس لفظ کا ٹھیک ٹھیک مطلب کیا ہے؟ یہ بات تو ناقابل تردید ہے کہ سائنسی پسماندگی اس بحران کا ایک حصہ ہے اور اس وجہ سے یہ امر یقینی ہے کہ مستقبل میں بھی مغرب کا غلبہ قائم رہے گا لیکن یہ بحران حقیقت میں سیاسی ہے۔ جس کی ہمارے سامنے کئی افسوس ناک مثالیں موجود ہیں۔

جب 1982ء میں اسرائیلی فوجیں بیروت کو ایک منصوبے کے تحت تباہ و برباد کر رہی تھیں اور عمل ملیشیا (فوج) کے محاصرے میں بند فلسطینی مذہبی علماء سے یہ فتویٰ مانگنے کے لئے مجبور ہوئے تھے کہ کیا اس حالت میں انسان کا گوشت کھانا جائز ہے یا نہیں، اس وقت تمام مسلم ممالک خاموش تماشائی بنے رہے۔ اسی طرح جب اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں میں انتفاضہ کی تحریک کے دوران ٹی وی کیمروں کے سامنے اسرائیلی سپاہی فلسطینیوں کے اعضاء کی ہڈیاں توڑ رہے تھے اور بچوں کو ٹھوکریں مار کر قتل کر رہے تھے، اس وقت بھی کسی مسلم ملک کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ یہ خوفناک مناظر ٹی وی کی سکرین پر تمام دنیا میں دکھائے گئے لیکن عرب ملکوں میں ان کو دانستہ طور پر نہیں دکھایا گیا۔ انتفاضہ کی بغاوت پر ایک جذباتی نظم میں شامی شاعر نزار قبانی نے عرب قوموں کے متعلق کہا کہ وہ تعلق رکھتی ہیں۔ ”اس نسل سے جو فریب دلائی، غلاظت اور قہنگی کی نسل ہے، جس کی تجارت سے سیاست اور ظلم، قبریں کھودنا اور ایسے اہداف تعمیر کرنا جن کو انتفاضہ میں پتھراؤ کرنے والے بچوں کی نسلیں اپنا نشانہ بنائیں گی۔“

ایران و عراق کے درمیان سات سالہ جنگ کو انسانیت کے خلاف بڑے جرائم میں شمار کیا جائے گا کیونکہ اس جنگ میں کیمیاوی ہتھیار استعمال کئے گئے، آبادی کے مراکز پر بم برسائے گئے اور بچوں کو فوج میں بھرتی کر کے جنگ میں جھوٹا کیا گیا۔ دونوں ملکوں کا دعویٰ تھا کہ یہ جنگ

جہاد ہے۔

یہ مثالیں اسلامی دنیا کے بحران کی شدت کو ظاہر کرتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر اقبال احمد کے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ دولت اور کمزوری مادی وسائل اور اخلاقی پستی کے درمیان تعلق اتنا واضح ہو۔ وہ کہتے ہیں:

”مراکش سے شام اور عراق سے پاکستان اور انڈونیشیا تک مسلمانوں پر مسلح اقلیتوں کی حکمرانی ہے۔ کچھ حکومتیں خود کو اشتراکی اور جمہوری، کچھ اسلامی اور کچھ اسلامی اشتراکی اور جمہوری کہتی ہیں۔ تقریباً ساری ہی مسلمان حکومتیں بدعنوان اور بے رحم اشرافیہ پر مشتمل ہیں جو قدرتی وسائل و قومی آزادی کے تحفظ کی نسبت عوام کو دبا کر رکھنے میں زیادہ ماہر ہیں۔ ان کا تعلق اپنے عوام کی سیاست سے کم اور بیرونی سرپرستوں سے زیادہ ہے۔“

نوآبادیاتی عہد اور مابعد کے زمانے میں اسلامی تہذیب کو جس بنیادی بحران اور زوال کا سامنا کرنا پڑا اس سے نپٹنے کے لئے تین رویے سامنے آئے۔ ان رویوں کو اقبال احمد کی زبان میں احیاء، اجتہاد اور عملیت کے رویے کہا جا سکتا ہے۔ رویوں کی یہ تقسیم ہمیں ایک ایسا مفید چوکھٹا فراہم کرتی ہے، جس میں رہ کر ہم موجودہ اسلامی دنیا میں عقلی اور سائنسی معاشرے کی نشوونما کے امکانات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

احیاء اسلام

”احیاء“ مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظریہ ہے۔ اس نظریے کے مطابق ماضی کے کسی عینی تصور اسلام کا احیاء ہونا چاہیے کیونکہ تمام ناکامیاں اور شکستیں صراطِ مستقیم یا سیدھے راستے سے بھٹکنے کی وجہ سے ہیں۔ اس سوچ کا اظہار 1970ء کی دہائی میں کئی بنیاد پرست اسلامی تحریکوں کی شکل میں ہوا ہے۔ سیکولر مملکت مصر، سعودی عرب کی وہابی اسلامی سلطنت، آیت اللہ خمینی کی انقلابی شیعہ مملکت ایران اور جنرل ضیاء کی اسلامی مملکت پاکستان میں جہاد کے نفاذ کے بجائے گئے۔ دنیاوی، عقلی اور آفاقی نظریات کے خلاف جہاد، سرمایہ داری، سوشلزم اور کمیونزم کے خلاف جہاد، یعنی اسلامی ریاست کے کسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جہاد آٹھ سو سال پہلے عرب فلسفی ابن رشد کے اس اصول کے خلاف جہاد کہ انسان کی عقل ہی وہ عامل ہے جسے انسانی معاشرے کا رہنما ہونا چاہیے اور جدید دنیاوی اور سائنسی سوچ اور طریقے

اور اس علم کے عملی پہلو اسی خرابی سے آلودہ ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کئی طور پر ان نظریات اور اقدار پر مبنی ہیں جو اس کے اراکین کو عزیز ہیں۔ اگر درخت کی جڑیں فاسد ہیں تو درخت بھی فاسد ہے۔ اس لئے اس کے تمام پھل بھی فاسد ہیں۔“

مریم جمیلہ کے مطابق احادیث یا سنت میں ہی تمام اچھائی ہے اور تمام مسائل کا حل اس سے ہی مل سکتا ہے۔ مسلسل ترقی اور تغیر پر جدید سائنس کے اصرار کی مذمت وہ ان الفاظ میں کرتی ہیں:

”(اسلامی معاشرے میں) طبع زادیت، اختراع اور تغیر کو کبھی اصلی اقدار نہیں مانا گیا۔ اسلامی تمدن و ثقافت کا نصب العین مشینی یا ارتقائی ترقی نہیں بلکہ قرآن و سنت پر مبنی ابدی، غیر متغیر، ماورائی، الہامی، اخلاقی، دینی اور روحانی اقدار ہیں۔“

اس لئے مریم جمیلہ کے نزدیک مغربی سائنس کی شیطانی اور لحدانہ نیچر کے پیش نظر ترقی کی دوڑ میں مغرب کو جا لینا نہ تو ضروری ہے اور نہ ہی پسندیدہ بات ہے۔ پرانا زمانہ کتنا اچھا تھا، جدید زمانے نے روح کو خراب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔ مریم جمیلہ اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں احادیث کا سہارا لیتی ہیں۔ مثلاً یہ حدیث ان کی کتاب کے پہلے صفحہ پر درج ہے:

”عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول نے کہا: جو کوئی بھی ہماری اس چیز (اسلام) میں کوئی اختراع شامل کرے جو کہ اس کی نہیں ہے، تو اس (شخص) پر لعنت ہو۔“

(مسلم، بخاری)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو جماعت اسلامی کے بانی اور عصر حاضر کے نہایت بااثر اسلامی مفکر ہیں نے بھی مغربی سائنس پر شدید اعتراضات کئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے موضوع پر ایک خطبے میں انہوں نے ارشاد فرمایا کہ جغرافیہ، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، حیوانیات، ارضیات اور معاشیات کے علوم اللہ اور اس کے رسول کا حوالہ دئے بغیر پڑھائے جاتے ہیں، اس لئے گمراہی کا سبب ہیں۔

”جدید تعلیم اور رسوم پر غور کرنے سے جلد ہی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اسلامی تعلیم اور رسوم سے متضاد ہیں۔ تم ان ذہنوں کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہو جو اللہ کے بغیر کائنات کی تشریح کرتا ہے۔ تم انہیں وہ سائنس پڑھاتے ہو جو معقولیت سے محروم اور حواس کی غلام ہے۔ تم انہیں وہ

معاشریات، قانون اور عمرانیات پڑھاتے ہو جو ذہنی و مادی طور پر اسلامی تعلیمات سے اختلاف رکھتی ہیں اور اس کے باوجود تم یہ توقع کرتے ہو کہ ان کا نقطہ نظر اسلامی ہوگا؟“

اس برائی سے بچنے کے لئے مولانا یہ حل پیش کرتے ہیں کہ تمام تعلیمات کو اسلامی تعلیمات میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اس خرابی کی تمام تر ذمہ داری دنیاوی تعلیم سے دینی تعلیم کی علیحدگی ہے، جیسا کہ میں نے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ یہ علیحدگی قطعی غیر اسلامی ہے۔ تعلیم کے نئے نظام میں دینیات کے لئے نصاب کی ضرورت نہیں بلکہ تمام نصابوں کو دینیاتی نصابوں میں تبدیل کرنا چاہیے۔

مولانا کی بصیرت سے متاثر ہو کر اسلام آباد کے انسٹی ٹیوٹ فار پالیسی اسٹڈیز

(Insitute for Policy Studies) نے (یہ ادارہ جماعت اسلامی کے مرکز دانش کے طور پر کام کرتا ہے) اپنے ذمہ یہ کام لیا ہے کہ سائنس کی دوسری تعریف کی جائے اور اسلامی سائنس کی نصابی کتب تحریر کرانے کے لئے رہنما اصول مرتب کئے جائیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ نے جو سفارشات کی ہیں، ان کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے:

1- اللہ تعالیٰ کے کرم کا حوالہ دیئے بغیر قدرت کے کسی اصول، طریق کار یا حقیقت کا حوالہ نہ دیا جائے۔ مثال کے طور پر تیسری جماعت کے بچوں کی سائنس کی کتاب میں اس سوال کے بجائے کہ ”اگر ایک جانور کچھ بھی نہ کھائے تو کیا ہوگا؟“ یہ سوال کیا جائے کہ اللہ اگر جانور کو کھانا نہ دے تو کیا ہوگا؟“

2- سائنس کی نصابی کتاب صرف ایسا شخص تحریر کرے جو راسخ عقیدہ رکھتا ہو کہ صرف اسلام ہی ضابطہ حیات ہے اور جو قرآن و سنت سے بخوبی واقف ہو۔ اس سلسلہ میں تمام امکانی احتیاط کی جائے۔

3- معلول کا رشتہ مادی علت یا سبب سے نہ جوڑا جائے۔ ایسا کرنے والا الحاد کی طرف جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انسٹی ٹیوٹ کی سفارش کے مطابق ”اس ذیلی عنوان میں زہر پوشیدہ ہے کہ ”توانائی تبدیلی کا باعث ہے“ کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تبدیلی کا صادق سبب اللہ نہیں بلکہ توانائی ہے۔ اسی طرح یہ درس دینا غیر اسلامی ہے کہ ہائیڈروجن کو آکسیجن سے مرکب کیا جائے تو اپنے آپ پانی بن جاتا ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے: جب ہائیڈروجن کے

ایٹم آکسیجن کے ایٹموں سے ملتے ہیں تو اللہ کی رضا سے پانی پیدا ہوتا ہے۔“

4- پہلے باب کا (مثلاً کیمیا کی کتاب کے باب کا) عنوان ضروری طور پر یہ ہونا چاہیے: ”قرآن مقدس اور کیمیا“۔ ہر باب کا آغاز کسی مناسب قرآنی آیت یا حدیث سے ہونا

چاہیے۔

5- کسی بھی اصول یا قانون کا نام سائنس دان کے نام پر نہیں رکھنا چاہیے۔ مثلاً ”نیوٹن کے قوانین“، ”بوائس کا قانون“ وغیرہ کہنا غیر اسلامی ہے کیونکہ یہ شرک کے مترادف ہے۔ اس طرح نام رکھنے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گویا سائنس دانوں نے یہ قوانین دریافت نہیں کئے بلکہ بنائے ہیں۔

6- سائنس کی کلاسوں میں اللہ کا تعارف ہونا چاہیے۔ ”ہماری سائنس کی نصابی کتب میں اللہ کے پاک وجود اور روز قیامت (یا حیات بعد الموت) کو ثابت کرنے کے لئے دلائل ہونے چاہئیں۔ ان مضامین کے ایسے مطالعے کو سائنس کا مطالعہ سمجھا جانا چاہیے نہ کہ اسلامیات کا۔“

7- حیوانیات کا نصاب پڑھانے میں ابتدا سے ہی مولانا مودودی کی ”تفہیم القرآن“ کو بطور رہنما اصول استعمال کرنا چاہیے۔

8- تمام سائنسوں کی پیدائش مسلمانوں کے عہد سے سمجھی جانی چاہیے۔ نیوکلئیائی طبیعیات ابن سینا سے، کیمیا جابر ابن حیان سے شروع ہوتی ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ سائنس کی ابتدا کا سہرا یونانیوں کے سر نہیں باندھنا چاہیے۔ کیونکہ وہ تجربی سائنس سے بالکل نابلد تھے۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی مندرجہ بالا سفارشات مندرجہ ذیل دو مختصر تبصروں کی مستحق ہیں:

اولاً ان سفارشات میں سائنس کے اس بنیادی اصول کی خصوصاً نفی کی گئی ہے کہ ہر مادی اثر (معلول) کا مادی سبب (علت) ہوتا ہے۔ گویا مادی یا مرئی قوتیں نہیں بلکہ مادہ مقدس طاقتوں کے اشارے پر حرکت کرتا ہے۔

ثانیاً ان سفارشات میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ بچوں میں تجسس پیدا کیا جائے۔ ان میں سوال کرنے یا تکتہ چینی کے رویے کی نشوونما کی جائے یا ان کو بتایا جائے کہ کبھی صاحب اختیار بھی غلطی پر ہو سکتا ہے۔

سچ بات تو یہ ہے کہ بنیاد پرست نظریات میں حقیقی سائنس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک بند ساکن اور پہلے سے معین کائنات میں سائنس کی کوئی افادیت نہیں ہو سکتی۔ سائنس اور جدید روشنی کے متعلق جماعت اسلامی کا نقطہ نظر بنیاد پرستوں کے عمومی نظریات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اخوان المسلمین کے سید قطب (جن کو مصر کے جمال عبدالناصر نے دیگر بنیاد پرستوں کے ساتھ پھانسی کی سزا دی تھی) نے سائنس پر اپنے نظریات کا اظہار ”فی ضلال القرآن“ میں کیا ہے۔ یہ نظریات جماعت اسلامی کے نظریات سے مختلف نہیں، اس لئے ان پر علیحدہ بحث غیر ضروری ہوگی۔

اجتہادی رویہ

کٹر بنیاد پرستوں کی سائنس اور جدید تہذیب کی اندھی مخالفت کے برعکس اجتہادیوں کا رویہ یہ ہے کہ دین کی جدید تفسیر اس طرح کی جائے کہ جدید تہذیب کے تقاضوں اور اسلامی تعلیمات و روایات کے درمیان مفاہمت پیدا ہو جائے۔ اس مکتب خیال کے مطابق اسلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ کے دور انقلابی ترقی پسند روادار اور عقلی دور تھے۔ لیکن بعد کے ادوار میں اجتہاد پر تقلید کی فوقیت کے باعث کٹر پن اور غیر استدلالی رویے پیدا ہو گئے۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ انقلابی اور ترقی پسندانہ خصوصیات سے محروم ہو گیا۔ برصغیر ہندوپاک میں اجتہادی نظریے کے سب سے زیادہ بااثر مبلغ سید احمد خان اور سید امیر علی ہیں۔

سید احمد خان (1817-1898ء)

انیسویں صدی میں اسلام کو ازمندہ وسطی سے جدید دور کی طرف لانے کے لئے نظریاتی تبدیلی کی تحریک کے قافلہ سالار ایک ہندوستانی مسلمان سید احمد خان تھے۔ انگریزوں کے خلاف 1857ء کی بغاوت کی ناکامی اور اس صدمہ کے ہندوستانیوں اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں پر اثرات نے سید احمد خان کے اندر یہ تحریک پیدا کی کہ وہ اسلام کی نئی تشریح کریں۔ عصر جدید میں وہ سب سے زیادہ روشن خیال مفکر ہیں، اس لئے آج تک یعنی تقریباً ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کے افکار متنازعہ ہیں۔

سید احمد خان مغل اشرافیہ کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ اگر مسلمانوں کو ”سائیس باورچی“ گھریلو نوکر، لکڑکٹ اور بہشتی“ کے علاوہ بلند درجوں تک پہنچانا

ہے تو وہ خطرناک علاج کرنا ہوگا جو مریض کی مایوس کن حالت میں کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پس ماندگی تو ہماتی عقائد اور مقولات کی اندھی تقلید کو مقولات پر ترجیح دینے کی وجہ سے تھی۔ اس لئے انہوں نے سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کی ایسی تفسیر کی جو مغرب کے بعد از نشاۃ ثانیہ کے انسانیت دوست اور سائنسی نظریات سے ہم آہنگ تھی۔ ان کے خیال میں ایسی تفسیر کے ذریعے غیر ضروری اور بے لچک عقائد کو ”حقیقی اسلام“ سے علیحدہ کرنا ضروری تھا۔

”میرے متحس دماغ نے مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔۔۔۔۔ اس نے مجھے

اس سچائی تک پہنچایا جو اسلام (حقیقی اسلام) ہے گو کہ روایتی مسلمان اسے کفر سمجھتے ہیں۔“
یہ ایک مشکل کام تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے اکبر کا دور حکومت ختم ہونے کے بعد عقل دشمنی اور سائنس دشمنی کا دور مسلسل قائم رہا۔ سید احمد خاں سے تقریباً دو سو سال پہلے شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) اور دیگر با اثر مذہبی علماء نے ریاضی اور دنیاوی سائنسوں کے خلاف فتوے جاری کئے تھے اور یہ مطالبہ کیا تھا کہ مسلمانوں کو صرف مذہبی خطوط پر تعلیم دی جائے۔ سر سید احمد خاں نے اس نظریے کے خلاف لکھا:

”اب میں نہایت عاجزی کے ساتھ پوچھتا ہوں۔ وہ مختلف مذہبی کتابیں جو آج موجود ہیں اور جن کو درس و تدریس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے ان میں سے کون سی ایسی ہیں جو مذہبی اصولوں کے مطابق مغربی فلسفے یا جدید سائنسی معاملات سے بحث کرتی ہیں؟ میں کہاں سے زمین کی حرکت یا سورج سے اس کی قربت کے متعلق تصدیق یا تردید چاہوں؟ اس لئے ایسی کتابوں کا نہ پڑھنا ان کے پڑھنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہاں اگر مسلمان سچا سوراہا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مذہب صحیح ہے تو اسے بے جھجک میدان میں آ کر مغربی علم اور جدید تحقیق کے ساتھ وہی کرنا چاہیے جو اس کے آباؤ اجداد نے یونانی فلسفے کے ساتھ کیا تھا۔ صرف اس وقت مذہبی کتابوں کی کوئی حقیقی افادیت ہوگی۔ طوطے کی طرح صرف ایک رٹ لگائے جانے سے اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“

مذہبی عالم کی حیثیت سے سر سید احمد خاں کے لئے مذہب کی سائنسی تفسیر کا کام سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ روایت سے جرأت مندی کے ساتھ قطع تعلق کر کے انہوں نے تجویز پیش

کی کہ قرآن کی جدید تفسیر اور تشریح کی جائے تاکہ طبعی حقیقت سے تمام ظاہری تضاد یا اختلاف دور ہو جائے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن کلام الہی ہے اور سائنسی سچائیاں بدیہی طور پر صحیح ہیں، اس لئے ان کے درمیان جو بھی تضاد ہے، وہ حقیقی نہیں بلکہ ظاہری ہے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن کی تفسیر کے لئے مندرجہ ذیل طریق کار تجویز کیا۔

1- قرآنی زبان کے استعمال، معنی اور صرنی اشتقاق کے شعبوں میں باریک بینی سے تحقیق کی جائے تاکہ زیر بحث لفظ یا عبارت کے صحیح مطلب کا تعین کیا جاسکے۔

2- یہ طے کرنے کا اختیار سائنس کی ثابت کردہ سچائی ہونا چاہیے کہ کسی عبارت کی مختلف تفسیروں سے کونسی تفسیر کو منتخب کیا جائے یا اسے استعاراتی تفسیر کی ضرورت ہے۔ اس سچائی تک عقلی دلیل کے ذریعہ پہنچا جائے اور ان پر پختہ یقین کیا جائے۔

3- اگر مقدس متن کے ظاہری معنی سائنسی تجربات کے ذریعہ ثابت کردہ نتائج سے متضاد معلوم ہوتے ہوں تو ایسے متن کی استعاراتی تفسیر کی جائے۔ اس سلسلے میں سید احمد خاں وہ طریق کار اختیار کرتے ہیں جو ابن رشد نے معقول کو منقول سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنایا تھا۔ تاہم وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ (سائنسی حقیقت کے مطابق) استعاراتی یا شہمی تفسیر ہی وہ معنی ہے جو صحیفے کے مصنف (خدا) کا مدعا ہے۔

مندرجہ بالا طریق کار اختیار کرنے کی وجہ سے سید احمد خاں نے مذہبیات کے کئی موضوعات کی انقلابانہ تفسیریں کیں اور اہم مسائل پر غیر روایتی نقطہ ہائے نظر پیش کئے۔ مثلاً انہوں نے ڈارون کا نظریہ ارتقا قبول کرنے کے لئے یہ دلیل دی کہ آدم و حوا کا زمین پر پھینکا جانا انسان کے لئے اس امر کی علامت ہے کہ وہ اچھے اور برے کے درمیان تمیز کرے اور اس طرح مکلف ہو کہ دیگر جانداروں سے ممتاز ہو جائے۔ انہوں نے طوفان نوح، حضرت عیسیٰ کے معجزات، معراج اور ایسے دوسرے واقعات کی بھی، جن کو وہ مانوق الفطرت سمجھتے تھے، علامتی تفسیریں پیش کیں۔ سید احمد خاں کے نزدیک قرآن حکیم اخلاقی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے نہ کہ سائنسی معلومات فراہم کرنے کے لئے۔

اس زمانے کے مذہبی علماء کی رائے میں سید احمد خاں کی سب سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ تھی کہ وہ جدید ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے شریعت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ حسب توقع

اس وجہ سے سید احمد خاں بہت زیادہ مطعون کئے گئے۔ سید احمد خاں نے کوئی نئی شریعت نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مشہور مستشرق ولیم کینٹ ویل سمٹھ کے خیال میں اقتدار یا اختیار کی روایتی اصل پر یہ سیدھا حملہ جاگیر داری نظام سے گزر کر سرمایہ داری نظام کی طرف قدم بڑھانے کے لئے ضروری تھا۔

”نہ صرف یہ کہ اقتدار کے زیر بحث ادارے بے وقت اور غیر متعلق ہو گئے ہیں۔۔۔۔۔ یعنی یہ ایسے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ معاشرے میں پیدا ہی نہیں ہوتے۔۔۔۔۔ بلکہ ان کے تمام اخلاقی قاعدے اب اصولی طور پر متروک ہو چکے ہیں۔۔۔۔۔ فرد بجائے خود اخلاقی اعتبار سے ذمہ دار ہے اور اسے سوالات خود بھی حل کرنے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ اس لئے سید احمد خاں نے پرانی شریعت کو رد کر کے اس کی جگہ نئی شریعت نہیں دی اور نہ ہی ان کے جانشینوں نے ایسا کیا، تاہم انہوں نے قرآن کے صرف عام اخلاقی اصولوں پر زور دیا۔“

گو کہ سید احمد خاں کو پاکستان میں مسلم قومیت کا پہلا شارح سمجھا جاتا ہے لیکن مذہب اور سائنس کے متعلق ان کے نظریات کی حمایت کرنے والے بہت کم ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔ انگریزوں کی خوشامد اور عورت مخالف رویے کی وجہ سے وہ موجودہ دور کے کئی قوم پرستوں اور ترقی پسندوں کو بھی عزیز نہیں ہیں۔ تاہم وہ ایسی شخصیتوں میں یقیناً سب سے زیادہ اہم ہیں جنہوں نے اسلام اور جدید دور کے درمیان پل بنانے کی کوشش کی تھی۔

سید امیر علی (1849-1924ء)

سید امیر علی نے علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ وہ سید احمد خاں کے مضبوط پیروکار تھے۔ ان کی شاہکار کتاب "The Spirit of Islam" ایک مقصد کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی اور وہ مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ صحیح اسلام انقلابی عقلی اور ترقی پسندانہ مذہب ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1891ء میں شائع ہوئی۔ 1922ء تک اس میں کئی بار اضافے کئے گئے اور یہ کئی بار شائع ہوئی۔ اسے تمام دنیائے اسلام میں پڑھا گیا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جدید زمانے کے مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے یہ ایک قطعی اور ہمہ گیر کام تھا جو بیشتر مستشرقین کی بددینی پر مبنی اسلامی تاریخ، اقدار اور مذہبیات کی ترجمانی کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن یہ

پرستانہ تحریک در آئی اور یکا یک انسانی فکر کا دھارا بدل گیا۔ سائنس اور فلسفہ کی پرورش کرنے والوں کو اسلام سے خارج قرار دیا گیا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سنی مکتب فقہ بھی کلیسائے روم سے کچھ سبق سیکھے؟ کیا اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ بھی کلیسائے روم کی طرح پھیل کر ہمہ جہت ہو جائے؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات میں ایسی کوئی بات نہیں جو اس بات سے منع کرتی ہے۔ اسلامی پروٹسٹنٹ تحریک نے (جو اپنے ارتقا کے ایک دور میں معتزلہ تحریک تھی) اس کے لئے پہلے ہی راہ ہموار کر دی ہے۔ سنی مکتب فقہ پرانی قیود توڑ کر نئی زندگی کیوں اختیار نہیں کر سکتا۔

سید احمد خاں اور سید امیر علی نے ایک طرف سائنس اور فلسفہ کا زور دار دفاع کیا تو دوسری طرف معاشرتی معاملات میں عام نرمی اور روشن خیالی کا رویہ اپنایا۔ انہوں نے کثرت ازدواج اور پردے کو جدید زمانے کے تقاضوں کے خلاف قرار دیا۔ جہاد کو درحقیقت ذہنی یا فکری جنگ کے مترادف سمجھایا اور زور دے کر کہا کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام جنگیں خالص دفاع کے مقصد سے لڑی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے یا زنا کے لئے سنگسار کرنے کی سزائیں ایسے قبائلی معاشروں میں مناسب تھیں جن میں قید خانے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ قرآن حکیم ایسی زبان میں ہے جو عام ریگستانی لوگوں کی سمجھ میں بھی آ سکتی ہے۔ مثلاً جنت کی حوریں وہ مخلوق ہیں جن کا تذکرہ زرتشتی مذہب میں ہے جبکہ دوزخ اور اس کی سخت سزائیں تلمود سے ماخوذ ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ”خالص اسلام“ کے احیاء اور عصر جدید سے اسلام کی ہم آہنگی ثابت کرنے کے لئے جدیدیت اور اجتہاد کے حامیوں کو پل صراط پر چلنا پڑا۔ یہ فیصلہ مشکل ہے کہ آیا اسلام کی تنظیم نو کے لئے ان کی کوششیں مضبوط یقین پر مبنی تھیں یا مسلمانوں کے مستقبل سے متعلق حقیقت پسندانہ تردد کا نتیجہ تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اس طرز عمل کے پیچھے متعدد محرکات کارفرما تھے، مثلاً سچا یقین، کٹر مذہبیت کا خوف، یہ یقین کہ اگر مسلمان جدید تہذیب و ترقی کو ٹھکراتے رہے تو تباہ ہو جائیں گے اور یہ خیال کہ ہم مغرب کو اچھے نظر آئیں۔ سید احمد خاں کی مساعی مندرجہ بالا محرکات کا مظہر ہیں۔ انہوں نے کٹر پن کے شدید ترین غیظ و غضب کا سامنا کیا۔ ان کی بنائی ہوئی علی گڑھ یونیورسٹی کا بائیکاٹ کیا گیا۔ علماء

نے ان کے خلاف کفر و الجاد کے کئی فتویٰ جاری کئے۔ مقدس خانہ کعبہ کے متولی نے انہیں اسلام کا دشمن اور واجب القتل قرار دیا۔ بایں ہمہ سید احمد خاں نے مسلمانوں کے مفادات کے دفاع اور ان کی ترقی کے لئے جو جدوجہد کی اس کے باعث آئندہ نسلیں ان کا نام یاد رکھیں گی۔

عملیت پسندوں کا رویہ

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اکثریت عملیت پسندوں پر مشتمل ہے۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ دین و مذہب کے تقاضوں کو سیاسی و معاشی زندگی یا سائنس اور دنیاوی علوم سے علیحدہ رکھا جائے۔ عملیت پسند اس مبہم سے یقین کو کافی سمجھتا ہے کہ اسلام اور جدید دور کے تقاضوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ وہ اس قسم کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اس کے نزدیک نئے زمانے اور اسلام کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے قرآن کی اجتہادی تفسیر یا نئے معنی کی تلاش کوئی خاص ضروری کام نہیں ہے۔

نئے زمانے اور سائنس کے حامی ابتدائی عملیت پسندوں میں جمال الدین افغانی (1838-1897) کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ افغانی کے خیالات نے مسلمانوں کو مغربی استعمار کے خلاف جدوجہد میں ابھارا تھا۔ انہوں نے سامراج کے خلاف اسلام کے عسکری کردار پر زور دیا تھا۔ ان کے نظریات کا یہ رخ روشن خیال مفکروں اور قدامت پرست بنیاد پرستوں کے لئے یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ کبھی کبھی ان کو عصر حاضر میں اسلامی احیاء کا ہرا دل دستہ کہا جاتا ہے اور عربی ادب میں ان کو ”شمع مشرق“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ سائنس اور جدید زمانے پر افغانی کے نظریات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں، کیونکہ سید احمد خاں (جو افغانی کے ہم عصر تھے) جیسے مجتہدین کے برعکس افغانی نے اسلام کی نئی تفسیر نہیں کی۔ اس کے بجائے انہوں نے مغرب کے نوآبادیاتی سامراج کے خلاف اسلام کی متحد کرنے والی خصوصیت پر زیادہ زور دیا۔ ان کا کارنامہ یہ تھا کہ مسلمان عوام کو غیر ملکی سامراجی غلبہ کے خلاف ابھارا اور ان میں مقصدیت و تفاخر پیدا کیا۔

ان کے سوانح نگار کئی کیڈی کے مطابق افغانی دراصل اسعد آباد ایران میں پیدا ہوئے تھے نہ کہ افغانستان میں، جیسا کہ وہ خود دعویٰ کرتے تھے وہ تدریس کے ابتدائی دور میں ابن سینا جیسے

ایجادات کیا ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت ہمارے علماء ایک بہت ہی پتلی جتی کی مانند ہیں، جس کے اوپر ایک چھوٹی سی لوٹٹما رہی ہے جو نہ تو اپنے آس پاس روشنی کرتی ہے اور نہ ہی دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ آج کل ہمارے علماء نے سائنس کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ وہ ایک کو مسلم سائنس اور دوسرے کو فرنگی سائنس کہتے ہیں اور اس تقسیم کے ذریعہ انہوں نے کئی مفید سائنسوں کی تعلیم ممنوع قرار دے دی ہے۔“

جمال الدین افغانی کا عملیت پسند پہلو سب سے زیادہ اس خط و کتابت میں نمایاں ہے جو انہوں نے اسلامیات کے نامور فرانسیسی محقق ارنسٹ رینان سے کی تھی۔ یہ خط و کتابت بلاشبہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دراصل مغرب کے مانے ہوئے مخالف مذہب اور ایک مخلص مسلمان کے درمیان مباحثہ ہے۔ لیکن کیڈی کے بقول، اس مباحثہ کو مسلم دنیا میں مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ رینان نے چونکہ اسلام کو سائنس کا مخالف قرار دیا تھا، اس لئے افغانی نے یہ جواب دیا ہوگا، کہ اسلام تو سائنس دوست ہے۔۔۔۔۔ یہ مفروضہ غلط ہے۔ افغانی کی حالیہ ترجمہ شدہ دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایک چہرہ دکھاتے تھے اور مغرب کے سامنے دوسرا چہرہ پیش کرتے تھے۔

یہ مشہور مباحثہ کس طرح شروع ہوا؟ اس واقعے کی تلخیص مندرجہ ذیل ہے: مارچ 1883ء میں ارنسٹ رینان نے ”اسلام اور سائنس“ کے عنوان سے ایک لیکچر دیا جو بعد میں ”جنرل دی دیات“ میں شائع ہوا۔ اس لیکچر میں اس نے تمام مذاہب پر کٹھنہ چینی کی لیکن اس کا خاص ہدف تنقید اسلام تھا کیونکہ اس کی رائے میں اس مذہب میں روحانی اور دنیاوی شعبوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ بقول دینان اسلام Dogmatic یا عقیدہ ”انسانیت کے گلے کا سب سے زیادہ وزنی طوق بن گیا ہے“۔

بعد کے ایک مضمون میں دینان نے یہ شدید نقطہ نظر پیش کیا ہے: ”اگر انسانی دماغ اپنے ضروری کام، یعنی مثبت سائنس کی تعمیر سرانجام دینا چاہتا ہے تو اسے تمام مافوق الفطرت عقائد سے آزاد ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تشدد سے خاتمہ کیا جائے یا تیزی سے قطع تعلق کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ عیسائی عیسائیت چھوڑ دے یا مسلمان اسلام ترک کر دے۔ عیسائیت اور اسلام کے روشن خیال لوگوں کو رواداری کے ایسے

کرنے والا ہر شخص قابل نفرت خدا تھا اور اس پر ہر طریقے سے حملہ کرنا جائز تھا۔ سید احمد خاں پر کفر یا غیر مقلد ہونے کے الزام کی بنیاد پر حملہ زیادہ کارگر ہو سکتا تھا کیونکہ اس طرح برطانوی سامراج کے مخالف راسخ العقیدہ ہندوستانی علماء کی حمایت کی ضمانت حاصل ہو سکتی تھی۔

غالباً افغانی پہلے جدید عملیت پسند تھے۔ وہ ایسے لیڈر تھے جو مسلمان عوام کو میدان عمل میں لانے کے لئے مذہبی جذبہ کی زبردست قوت کا شعور رکھتے تھے۔ دوسروں کی طرح انہوں نے مذہب کو سیاسی قوت کے طور پر استعمال نہیں کیا، اس کے بجائے انہوں نے اقتصادی و سیاسی زندگی سے مذہب کو علیحدہ رکھنے پر زور دیا۔ اتارک کے ترکی میں عملیت پسندی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ انقلاب کے دنوں میں ضیاء گوکلپ نے یہ نعرہ دیا تھا ”ترک قوم مسلم مذہب اور یورپی تہذیب کے ہو جاؤ“۔

حاصل کلام

نوآبادیاتی سامراج کا عہد ختم ہونے کے بعد اسلامی دنیا کے افق پر متعدد عملیت پسند رہنما نمودار ہوئے۔ محمد علی جناح، جمال عبدالناصر، حبیب بورقبیہ اور ذوالفقار علی بھٹو ایسے لیڈر تھے جنہوں نے اسلام کی تعریف میں محض لفاظی کرنے کے بجائے عوام کو عمل کرنے پر اکسایا۔ گو کہ عصر حاضر کی اسلامی دنیا میں احیاء پسند بنیاد پرستی کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملیت پسند مسلمان اب بھی اکثریت میں ہیں۔ پاکستان میں 1970ء کے انتخابات میں ذوالفقار علی بھٹو کی سیکولر پاکستان پیپلز پارٹی کے ہاتھوں بنیاد پرست جماعت اسلامی کی شکست فاش، اسلامی جمہوری اتحاد کے خلاف نومبر 1988ء کے انتخاب میں بے نظیر بھٹو کی فتح اور آیت اللہ خمینی کے ایران میں بنی صدر جیسے سیکولر شخصیت کی صدارتی انتخاب میں کامیابی، اس امر کا کھلا ثبوت ہیں کہ اگر کوئی بدل پیش کیا جائے تو عام مسلمان بنیاد پرستوں کے اسلامی تصور کو قبول نہیں کرتے۔ لیکن یہ بات معنی خیز ہے کہ گزشتہ دہائی میں مسلم معاشروں کی جدید دنیا کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی اہلیت اور ارادے کو کافی کمزور کیا گیا ہے۔ اسلامی دنیا میں سائنس اور تہذیب کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آیا خاموش اکثریت معاشرے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیتی ہے یا احیاء پرستوں کے حملے کی تاب نہ لا کر خاموش ہی رہتی ہے۔

باب ۶

ترجمہ (جو موجود نہیں وہ وجود میں نہیں آسکتا، اور جو موجود ہے وہ تباہ نہیں ہو سکتا)

مصنف فاتحانہ انداز سے دعویٰ کرتا ہے کہ اس سطر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے عہد عتیق کے ہندوستانی جدید طبیعیات کے ایک بنیادی ستون یعنی مادہ و توانائی کی بقا کے قانون سے واقف تھے۔ اس کو نہ صرف گیتا کی تقدیس کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ اس سے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مقدس صحیفوں کے نزول سے اب تک انسانی عقل و علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوا ہے۔

مثالوں کی کوئی کمی نہیں۔ بعض ہندو بنیاد پرستوں نے نہایت سنجیدگی سے وید کا یہ تصور بیان کیا ہے کہ کس طرح کائنات پر کرتی (ابتدائی مادہ) سے کچھ کپوں (ہندو کے عقیدے کے مطابق ایک کلپ چالیس ارب سال کا ہوتا ہے) کے عرصے میں تخلیق ہوئی اور یہی وہ بات ہے جو بعد میں جدید طبیعیات یا تخلیق کے Big Bang نظریے میں کہی گئی ہے۔ دیگر بنیاد پرست ہندو منو کے قوانین کو طبعی حقیقت کا بیان سمجھتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ مختلف مادوں کے درمیان فرق گنوں اور تن ماتراؤں کی مقدار میں فرق سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے بھی ہندو ہیں جن کو بہت خوشی ہے کہ اب آواگون سائنسی طور پر ثابت شدہ حقیقت ہے۔ وہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں بعض ماہرین نفسیات کی یہ گواہی پیش کرتے ہیں کہ مرتے ہی آدمی کے وزن میں یکا یک پچاس گرام کمی ہو جاتی ہے۔ ان کے بقول یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آتما (روح) نے جسم کو کہیں اور نیا جنم لینے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ پھر قاری نے پربھوگنیش کے اس حالیہ واقعے کے بارے میں سنا ہوگا کہ اس کی مورتی دودھ پیتی ہے جس کو دیکھنے کے لئے لاکھوں عقیدت مند جمع ہوئے۔ اس طرح ایک کے بعد ایک مثال دی جاسکتی ہے۔ لیکن میں پہلی مثال کا ہی زیادہ قریب سے جائزہ لوں گا۔ اس سے متعلق دو سوال پوچھے جاسکتے ہیں۔ پہلا کیا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ ”جو موجود نہیں وہ وجود میں نہیں آسکتا اور جو موجود ہے وہ تباہ نہیں ہو سکتا؟“ دوسرا ”کیا یہ صحیح ہے کہ گیتا کے اس اشلوک میں مادہ و توانائی کی بقا کے قانون کی طرف اشارہ ہے؟“

بہت سے شواہد یہ ثابت کرنے کے لئے جمع کئے تھے کہ اس موضوع پر ویدوں کا متن اس نظریے سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ لیکن افسوس کہ بعد میں یہ نظریہ غلط ثابت ہوا اور اس کی جگہ تخلیق کے "Big Bang" نظریے نے لے لی۔ اس تبدیلی سے ہندو بنیاد پرست ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے اور انہوں نے فوراً ویدوں میں ایسی عبارتیں تلاش کر لیں جو نئے نظریے سے مطابقت رکھتی تھیں اور ایک بار پھر نہایت فخر کے ساتھ عقل عقیق کی فتح کا دعویٰ کیا۔ قرآن کے بعض مفسروں نے بھی آیات سے سائنسی حقائق کے استنباط کا مذکورہ بالا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان مفسرین میں مورس بکائل سب سے زیادہ ممتاز اور مقبول مصنف ہے۔

مورس بکائل ایک فرانسیسی سرجن تھا جو بعد میں روحانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ اس کو اپنی کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" کی اشاعت کے بعد پورے عالم اسلام میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ یہ کتاب کئی زبانوں میں ترجمہ کی گئی ہے اور مسلمانوں کی مذہبی تنظیموں نے اس کی بے شمار جلدیں چھاپ کر تمام دنیا میں مفت تقسیم کی ہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی مدد سے بے شمار مبلغین بین الاقوامی ہوائی اڈوں اور امریکی یونیورسٹیوں میں لوگوں کو مسلمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن مسلم دانشوروں کو میں جانتا ہوں ان میں سے اکثر نے یا تو اس کتاب کو پڑھا ہے یا اس کے متعلق سن رکھا ہے۔ جہاں تک مصنف کا تعلق ہے وہ بلاشبہ مقبول ہے۔ شاید اس کا ایک سبب یہ ہے کہ وہ سفید فام ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نو آبادیاتی دور ختم ہونے کے باوجود سفید جلد اب بھی قابل احترام ہے۔ بہر حال اسلامی کانفرنسوں میں جناب بکائل کی بہت مانگ رہتی ہے۔ ایسی ہی ایک کانفرنس قرآن و سنت کے سائنسی معجزات پر پہلی بین الاقوامی کانفرنس تھی۔ جناب بکائل اس کے چیئر مین تھے۔

جناب بکائل کا طریقہ سادہ ہے۔ وہ اپنے قاری کی توجہ کسی ایک قرآنی آیت پر مبذول کرتے ہیں اس آیت کے مختلف ممکنہ معانی بتاتے ہیں اور وہ معنی منتخب کر لیتے ہیں جو کسی سائنسی حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مظاہر قدرت کے بیان میں بائبل نے اکثر غلطیاں کی ہیں لیکن قرآن کے بیانات ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں اور قرآن نے جدید سائنس کی تمام بڑی دریافتوں کی صحیح پیش گوئیاں کی ہیں۔ اس نتیجے کے ثبوت میں وہ شہد کی مکھیوں، مکڑیوں، پرندوں، پودوں، مختلف قسم کی سبزیوں، جانوروں کے دودھ، جین اور انسانی

تنازل کے متعلق قرآنی حوالے پیش کرتے ہیں۔ غیر جاندار مادے سے متعلق ان کی بحث نظام شمسی کے سیاروں، کہکشاؤں اور مادے کے علاوہ کائنات کے پھیلاؤ اور خلائی تسخیر پر محیط ہے۔ ہر موضوع کے متعلق ان کی بحث کا اختتام اس نتیجہ پر ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کی سائنسی حقائق سے حیرت انگیز مطابقت قرآن کی معجزاتی نیچر کا ثبوت ہے۔

جناب بکائل اپنے طریق کار سے پوری طرح مطمئن معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ مسلمان جو ایمان اور عقلی دلائل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے ہیں، جناب بکائل کے طریق کار میں دو بڑے نقائص دیکھتے ہیں، گو کہ وہ قرآن شریف کی تقدیس میں یقین رکھتے ہیں۔

پہلا نقص: یہ ماننا چاہیے کہ کسی بیان یا دعوے کا ثبوت اسی صورت میں با معنی ہوتا ہے جبکہ اس کے غلط ثابت ہونے کے امکان کو بھی تسلیم کیا جائے۔ اس کا کیا مطلب ہوگا کہ اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ ایک مثلث کے زاویوں کی مجموعی ڈگریاں (درجے) 180 ہوتے ہیں اور پھر یہی بات ’ثابت‘ کی جائے کیونکہ ایمان یا اعتقاد رکھنے والے جانتے ہیں کہ قرآن کا کسی نہج سے غلط ہونا غیر ممکن ہے۔ اس لئے قرآن کی نیچر کو مقدس ثابت کرنے کی تمام کوششیں کلی طور پر بظاہر صحیح معلوم ہوں گی۔

دوسرا نقص: ایک ابدی صداقت کو سائنس کے متغیر نظریوں یا کلیوں سے منسلک کرنا خطرناک کام ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کائنات کے متعلق ہماری تفہیم میں بڑی تبدیلی آ سکتی ہے اور سائنس پرانے نظریات کو نہایت بے شرمی سے ترک کر کے نئے نظریات اپنالیتی ہے کیا سائنس کی ریگ رواں پر مذہبی نظریے کی بنیاد رکھنے سے مذہب کو نقصان نہیں پہنچے گا؟ مثال کے طور پر مورس بکائل واضح طور پر کہتے ہیں کہ قرآن میں ایسی کائنات کا تذکرہ ہے جو برابر وسعت پذیر ہے۔ اچھا، ہم اس بات کو تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کئے دیتے ہیں کہ نجوم کے مشاہدات کے ذریعہ اس مظہر قدرت کے ثابت ہونے کے بعد اچانک یہ دریافت کیا گیا کہ کائنات کی وسعت پذیری تو پرانے زمانے سے ایک معلوم شدہ مذہبی حقیقت ہے۔ اب سوچئے اس صورت میں کیا ہوگا اگر آئندہ نئے فلکیاتی مشاہدات سے یہ ثابت ہو جائے کہ کائنات پھیلنے کے بجائے سکڑ رہی ہے اور واقعی علمائے کائنات کو شبہ ہے کہ اب سے چند کھرب سال بعد کائنات کا پھیلاؤ بند ہو جائے گا اور پھر وہ سکڑنے لگے گی۔ اگر ہم یہ فرض کر

لیں کہ زندگی اس وقت بھی آج کی طرح ہی ہوگی، تو یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ چند کھرب سال بعد دنیا سکڑ رہی ہوگی تو بکائل کا پیر و کیا کہے گا؟ شاید وہ فلکیاتی مشاہدے کو مذہبی صداقت کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے رد کر دے گا۔ لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ وہ عربی زبان کے غیر دریافت شدہ نئے مطالب و معانی دریافت کرے گا اور ان کی بنیاد پر یہ ثابت کرے گا کہ پرانی تفسیریں غلط تھیں اور پھر کوئی ایسی مناسب عبارت تلاش کرے گا جو جدید سائنسی حقائق کے مطابق ہوگی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایم۔ بکائل کی کتاب میں ایک بھی ایسی پیش گوئی نہیں ہے جو اب تک نامعلوم ہو اور جسے مستقبل میں مشاہدے یا تجربہ کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہو۔ قرآن سے قدرتی سائنسوں کے استنباط کی جعلی سائنسی کوششیں، جن کی چند مثالیں پیش کی گئی ہیں، جدید دور کے بعض عظیم مسلمانوں کا ہدف تنقید رہی ہیں۔ مثال کے طور پر علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سر سید احمد خاں نے ایک زاویہ نگاہ پیش کیا ہے جو اس بنیاد پرستانہ فکر کے قطعی خلاف ہے جس کی نمائندگی بکائل کرتا ہے۔ سید احمد خاں کے نزدیک قرآن کو سائنس کی کتاب سمجھنا غلط ہے۔

مذہبیات کے عالم کی حیثیت سے سید احمد خاں نے اپنی تحریروں کا کافی حصہ قرآن کے ضروری پیغام کو یونانی علم فلکیات کے بعض مبہم اور غلط تصورات سے الگ کرنے میں صرف کیا۔ گو وہ قرآن کو مقدس اور الہامی صحیفہ مانتے تھے لیکن ان کی رائے میں قرآن سے سائنسی حقائق کا استنباط قطعی غلط فعل تھا۔ وہ کہتے ہیں:

”قرآن نہ تو یہ ثابت کرتا ہے کہ زمین ساکن ہے اور نہ ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ زمین حرکت میں ہے۔ اسی طرح، قرآن سے یہ بھی ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ سورج ساکن ہے۔ قرآن مقدس کو فلکیات کے ان مسائل سے کوئی تعلق نہ تھا، کیونکہ ان معاملات کا فیصلہ انسانی علم میں ترقی کے ذریعہ ہوتا تھا۔۔۔۔۔ دین کا حقیقی مقصد اخلاق کی اصلاح ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے پورا یقین ہے کہ خدائی عمل اور خدائی لفظ ایک دوسرے سے متضاد نہیں ہو سکتے، البتہ ہم اپنے غلط علم کی وجہ سے کبھی کبھی لفظ کے معنی سمجھنے میں غلطیاں کرتے ہیں۔“

سید احمد خاں کے عقیدے کا نچوڑ یہ ہے کہ ”دین کا حقیقی مقصد اخلاق کی اصلاح ہے۔“ وہ کہتے ہیں کہ سائنسی حقائق کو مشاہدات اور تجربات کے ذریعہ دریافت یا ثابت کرنا کہ مذہبی

کتاب کو سائنس کی کتاب سمجھ کر اس کے متن کی تفسیر سے۔ اپنے عقائد کی توضیح اور برطانوی ہند میں مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لئے تسلیم شدہ کردار کی وجہ سے سید احمد خان کا فلسفہ اصولاً بکالکت کی ان مختلف اقسام کا توڑ فراہم کرتا ہے جو آج کی دنیا میں بہت مقبول ہے۔

سید حسین نصر

اسلام اور جدید سائنس کے درمیان مطابقت ثابت کرنے کے لئے جدیدیت پسند مسلمان یہ دلیل دیتے ہیں کہ سائنس مسلم ممالک میں پھلی پھولی اور تقریباً پانچ صدیوں تک اس کی چمک دمک قائم رہی۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اسلام بلاشک و شبہ جدید سائنس کا حامی ہے۔ نئی روشنی کے حامیوں کی اس دلیل پر بعض بنیاد پرست مسلم علماء معترض ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول سید حسین نصر ہیں۔

سید حسین نصر ایران میں پیدا ہوئے وہیں ابتدائی تعلیم پائی۔ شیعہ عقائد انہیں ورثہ میں ملے۔ انہوں نے علم طبیعیات میں امریکی MIT سے انڈرگریجویٹ ڈگری حاصل کی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے تاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی (Ph.D) کیا۔ انہیں عالم اور اسلامی سائنس کے مورخ کی حیثیت سے متعدد کتابیں تصنیف کرنے کے باعث بجا طور پر شہرت حاصل ہوئی۔

قوت ابلاغ نے نصر کو ان مورخوں میں جو اسلام اور سائنس پر لکھ رہے ہیں سب سے زیادہ با اثر بنا دیا ہے۔ ان کی وقعت اور بھی زیادہ ہوتی اگر وہ انقلاب سے پہلے شاہ ایران کی حمایت نہ کرتے اور مصنفین کی ایک ایسی تنظیم کے صدر نہ ہوتے جسے سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس وجہ سے وہ ایران سے باہر رہتے ہیں اور گزشتہ کئی سالوں سے ایک امریکی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

سید نصر ایسے آزاد خیال اور جدت پسند دانشوروں سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام اور جدید سائنس کے درمیان مطابقت ہے۔ کیونکہ سید نصر کے خیال میں یہ لوگ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے اسلام کو دانستہ طور پر مسخ کرتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی کھال کھینچنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔

”جدیدیت پسند مسلمانوں کی معذرت خواہانہ تحریریں جدیدیت کو خوش کرنے کے لئے کسی بھی

پڑھ کر نماز پڑھنا بند نہیں کیا۔ اس کے برعکس آج کے طلباء جدید ریاضی اور کیمیا پڑھ کر دین سے انحراف کرتے ہیں۔“

کیا زمانہ وسطیٰ کی سائنس اور جدید سائنس کے درمیان یہ فرق حقیقت ہے؟ یہ سوال اتنا اہم ہے کہ ہمیں اس پر ذرا گہرائی سے غور کرنا چاہیے۔

سچ تو یہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ کی سائنس اور جدید سائنس کی بنیادوں میں دو بہت مختلف نظریات کارفرما ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کے سائنس دان، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، ایک معین نمونے یا نقشے کی حدود میں کام کرتے تھے، جو مافوق الفطرت اعتقادات، رسم و رواج اور منطقی مفروضات کا ایک پیچیدہ جال ہوتا تھا۔ قدرت سے متعلق سائنس کا بنیادی کام یہ ہوتا تھا کہ وہ کائنات کے اس نظام کے مقدس ہونے کی تصدیق کرے، جس کے خاص خدوخال الہامی صحیفوں میں بتائے گئے ہیں۔ سائنس اصولی طور پر مذہبی صداقتوں کی تشریح کرنے اور مادی وجود سے ماورا ہونے کی ضرورت پر زور دینے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ جوابات پہلے سے ہی معلوم تھے۔ سائنس کا کام یہ ثابت کرنا تھا کہ عقل اور طبعی حقائق سے ایمان کی تصدیق ہوتی ہے۔

علم ریاضی کو لیجئے جو آج ایک مجرد مضمون سمجھا جاتا ہے، جس کا کسی عقیدے سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ بھی پرانے وقتوں میں مختلف عقائد کے ساتھ وابستہ تھا۔ قدیم ہندسوں کے نظام میں مختلف ہندسوں کی کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت حیثیت ہوتی تھی۔ حساب کا علم پروہتوں کے پاس ہی ہوتا تھا اور اس کا مسکن مندر اور محل ہی تھے۔ یونان کے زمانے میں جیومیٹری کے علم کو ایک تقدس حاصل تھا اور مختلف اشکال کو دیوتاؤں سے نسبت دی جاتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ریاضی کو مذہب سے علیحدہ کرنا ایک طویل عمل تھا جو ہزاروں سالوں پر محیط رہا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ عام اصولوں۔۔۔۔۔ مثلاً اجسام یا اجرام کے گرنا۔۔۔۔۔ کو ثابت کرنے کی کبھی کبھی کوشش کی جاتی تھی لیکن ان کی اہمیت اور آفاقیت کی تفہیم یا تعریف پہلے سے موجود علم کی بنیاد پر یا اس کی روشنی میں ناممکن تھی۔ کبھی کبھی جدید قیاسیات کا خطرہ مول لیا جاتا تھا لیکن ثابت شدہ نقد علم اتنا کم تھا کہ اس کے استعمال سے بیشتر قدرتی مظاہر کی توجیہ یا پیش گوئی کرنا ممکن نہ تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی سائنس یہ تشریح نہیں کر سکتی تھی کہ زلزلے کیوں آتے ہیں، پہاڑوں سے آتش فشاں کیوں ہوتی ہے، سورج کس طرح روشنی دیتا ہے، زمین کیوں سورج کے گرد

گھومتی ہے، ہوائیں کس وجہ سے چلتی ہیں، بارش کیونکر ہوتی ہے؟ طاعون جیسی وبائی بیماریاں کیسے پھیلتی ہیں اور ان کا تدارک کس طرح کیا جانا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ اس زمانے کی لاعلمی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ طاعون کی وبا پھیلنے پر یورپ میں عیسائی بڑی تعداد میں یہودیوں کو قتل کر دیتے تھے کیونکہ یہ وہم عام تھا کہ جس ملک میں یہودی رہتے ہیں، وہاں کے باشندوں پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ مذکورہ بالا حالات سے مختلف حالات ہونے لگے تھے۔ ان دنوں میں تجربہ تو دور کی بات ہے، مشاہدے کا فن بھی ایسی غیر ترقی یافتہ حال میں تھا کہ سائنس آج کی طرح ترقی یافتہ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس عہد میں سائنس قدرتی عمل کی پیش گوئی اور فطرت کی تسخیر کا اوزار نہیں بن سکتی تھی۔ سارٹن کے بقول:

”ہمارے آباؤ اجداد جو علم رکھتے تھے، وہ بھی زیادہ قابل اعتبار نہیں تھا۔ ان کے کسی بھی سائنسی بیان کو چیلنج کیا جاسکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں مذہبی ساختیات غیر متزلزل معلوم ہوتے تھے۔ ان کی بنیاد مشاہدے پر نہیں تھی، اس لئے کوئی بھی مشاہدہ انہیں ختم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ استنباط پر مبنی نہیں تھیں، اس لئے کوئی بھی منطق ان کی تردید نہیں کر سکتی تھی۔“

ان دنوں میں مختلف مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد دینے کے لئے چونکہ سائنسی حقائق دریافت نہیں ہوئے تھے، اس لئے نعم البدل کے طور پر مذہبی دلائل یا قیاسیات استعمال کئے جاتے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر ہم دنیا کی ابدیت ثابت کرنے کے لئے ارسطو کے دلائل کے خلاف البیرونی کوشدت کے ساتھ سرگرم بحث دیکھتے ہیں کیونکہ وہ عدم سے وجود کی تخلیق کا قائل تھا۔ راجر بیکن اپنے زمانے میں آزاد خیال تھا اور سائنسی تحقیق کے جرم میں کلیسا نے اس کو قید بھی کیا تھا۔ لیکن اس کے نزدیک بھی سائنس کا خاص مقصد یہ تھا کہ وہ الہامی صحیفوں پر مبنی اعتقادات کی تائید کر کے ان کو تقویت پہنچائے۔

ازمنہ وسطیٰ میں کائنات کی تصویر مکمل درجہ وار نظام کی تھی۔ یہ کروں، حلقوں اور سماوات کی سخت مذہبی و طبعی دنیا کی آفاقی اور لطیف اسکیم کے تحت بنائی گئی تھی۔ اس شاندار تصویر میں سب سے پہلے چاند اور سورج کے کرے ہیں، پھر سیاروں کے کرے اور اس کے بعد ثابت ستارے جن کے آگے سماوات ہیں۔ مذہبی علم کائنات کا علم الملائکہ سے قریبی تعلق ہے۔ کیونکہ ملائکہ یا فرشتے سماوات کے محرکوں کی حیثیت سے بنیادی کام کرتے ہیں، مثال کے طور پر ابن سینا کے

علم کائنات میں اس قسم کے تصورات بھرے پڑے ہیں کہ فرشتوں کے ذریعہ چلائے جانے والا کائناتی نظام مادی کائنات کا ہی نہیں بلکہ عمرانی نظام اور انسانی بدن کے اندرونی نظام کا بھی احاطہ کرتا ہے۔ اسی طرح اخوان الصفا (جنہوں نے دسویں اور گیارہویں صدی میں عقلیت پسند اسماعیلی دانشوروں کی خفیہ تنظیم بنائی تھی) نے سیاروں کی حرکت اور جسم کے مختلف اعضاء کی بیماریوں کے درمیان مندرجہ ذیل مماثلت بتائی ہے۔

آکھیں	-----مشتری
کان	-----عطارد
تھنے اور سرپستان	-----زہرہ
خارج کرنے کی نالیاں	-----زلزلہ
منہ	-----سورج
ناک	-----چاند

جسمانی بیماری کو کسی نہ کسی جرم سماوی کے گہن سے مماثل سمجھا جاتا تھا۔ فلکی اجرام کی مماثلت کے دائرے میں ہر چیز شامل تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کی سائنس اور جدید سائنس کے درمیان ایک اور بڑا فرق ترقی کے متعلق زاویہ نگاہ کا ہے۔ جدید زمانے میں ہم غیر شعوری طور پر اس بات کو قدرتی اور ناگزیر سمجھتے ہیں کہ آئندہ نسلیں زیادہ معلومات رکھنے والی اور ترقی یافتہ ہوں گی۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ میں اس بات کو ناقابل یقین سمجھا جاتا تھا کہ بہت پرانے زمانے یا عہد عتیق میں زندگی بہت مختلف تھی یا یہ کہ پرانے زمانے کے لوگ مقابلاً کم علم رکھتے تھے۔ مثلاً البیرونی کو یقین تھا کہ عہد عتیق کے لوگ (بازنطینی، مصری، یونانی) اس کے اپنے لوگوں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ اس نے لکھا: ”ہمارے پاس جو سائنس ہے، وہ گزرے ہوئے زمانے کے علم کا عشرِ عشر ہے۔“

ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سائنس کو منطق کے جبر سے آزاد ہونا چاہیے:

”خالص اسلامی سائنس بنیادی طور پر انسانی عقل پر نہیں بلکہ خدائی عقل پر انحصار کرتی ہے۔ اس عقل کا مسکن دماغ نہیں بلکہ دل ہے اور استدلال دماغ کی سطح پر اس کا محض عکس ہے۔“

یہ الفاظ کانوں کو بہت اچھے لگتے ہیں اور ہمارے سامنے بے داغ معلومات کی سحر انگیز تصویر پیش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی تمام باتیں بے معنی اور خالی خولی ہیں۔ کوئی بھی سائنس جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ ”انسانی عقل پر نہیں بلکہ خدائی عقل پر انحصار کرتی ہے“۔ اس صورت میں یقیناً بہترین ہو سکتی ہے جبکہ اس سائنس پر عمل کرنے والے خدائی عقل رکھتے ہوں۔ بصورت دیگر یہ نہایت نزاع اور متنازع ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر نصر کی جدید اسلامی سائنس کی کامیابی ایسے خدائی عقل کی ترجمانی کرنے والوں کی یافت سے مشروط ہے جن کو متقی اور پرہیزگار لوگوں میں سے منتخب کیا جائے گا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر نصر کے پاس عملی، حقیقی اور معروضی قسم کے مسائل کے حل پر غور کرنے کے لئے وقت نہیں ہے، کیونکہ وہ نہایت جوش کے ساتھ جدید اسلامی سائنس کے لطیف تصور کی وکالت میں منہمک رہتے ہیں۔ یہ لطیف تصور جدید سائنس کے دنیاوی اور انسان دوستی پر مبنی تانے بانے سے الگ ہے اور اس میں ”عقل کا مسکن دماغ نہیں بلکہ دل ہے“۔ لیکن میں مندرجہ ذیل فرضی مثالوں سے یہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مادی اور معروضی مسائل سے فرار ممکن نہیں ہے۔

پہلی مثال: سائنس داں ”الف“ اور سائنس داں ”ب“ ڈاکٹر نصر کے تصور سائنس میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ دونوں دماغ کے بجائے دل کو عقل سمجھتے ہوئے براعظموں کی تشکیل کی تحقیق میں کوشاں ہیں۔ ”الف“ کسی مقدس صحیفے کی عبارت سے متاثر ہوتا ہے، کیونکہ اس میں وہ اس یقین کی تصدیق پاتا ہے کہ زمانہ بعید میں تمام براعظم ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ لیکن سائنس داں ”ب“ کو یقین ہے کہ براعظم سمندر سے اپنے آپ ابھر آئے ہیں اور وہ اس یقین کی تصدیق میں مقدس صحیفے کی ایک اور عبارت کا حوالہ دیتا ہے کیونکہ دونوں نظریات کی حمایت میں شہادتیں کافی ثقہ نہیں ہیں۔ اس لئے مذہبی مجلس معلیٰ سے رجوع کیا جاتا ہے۔ اس مجلس کے متقی، پرہیزگار اور معلومات رکھنے والے ارکان اس اہم مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ کافی غور و

خوض، عبادات اور وظائف کے بعد وہ یہ آخری فیصلہ سناتے ہیں کہ براعظم بنے تھے۔۔۔۔۔ اس عرصے میں دور پار کے کمیونسٹ روس میں ماہرین ارضیات کا ایک گروہ زمین کی ساختہانی پلیٹ کے متعلق ایک دریافت کرتا ہے جس سے براعظموں کے متعلق یہ مسئلہ حل ہوتا ہے کہ وہ کس طرح بنے تھے۔۔۔۔۔ لیکن مجلس ان کے نتائج کو ٹھکانہ عمل گردانتے ہوئے ان کی مذمت کرتی ہے۔

ڈاکٹر نصر مغربی سائنس پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ انسان اور فطرت کو تباہ کرتی ہے۔ شاید ان سے اختلاف نہ کیا جاسکے۔ لیکن پھر وہ ایک ایسی سائنس تعمیر کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں جو بے عیب، پرامن اور قدرت سے ہم آہنگ ہے۔ افسوس کہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ سائنس ہے کیا؟ اور اس کے خدوخال یا طریقہ کار کیا ہوگا۔ ان کی باتوں کا کھوکھلا پن ایک اور مثال سے واضح ہوگا۔

دوسری مثال: سائنس دان ”ج“ ایک عالم کیمیا ہے اور ارنانا نامی ملک میں رہتا ہے۔ سائنس دان ”و“ بھی ایک عالم کیمیا ہے لیکن وہ ارقانا نامی ملک کا باشندہ ہے۔ دونوں نے ڈاکٹر نصر کی کتاب "Plight of Modern Man" کا مطالعہ کیا ہے اور ڈاکٹر کے اخذ کردہ ان نتائج سے متفق ہیں کہ مغربی کلچر زوال پذیر ہے اور جدید سائنس تباہ کن ہے۔ ڈاکٹر نصر کے دلائل نے انہیں اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ مذہب پر مبنی سائنس کی اخلاقیات سائنس کو انسانی زندگی تباہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گی۔ پھر ارنانا اور ارقا کے درمیان ایک خوفناک جنگ چھڑ جاتی ہے اور اعصابی گیس دونوں ملکوں کی ضرورت بن جاتی ہے۔ دونوں سائنس دانوں سے ان کی حکومتیں درخواست کرتی ہیں کہ وہ ڈیفنسلکوریوٹیو اسائن کے مرکب کا امتزاج تیار کرنے کے لئے تحقیق کریں۔ یہ مرکب متاثر شخص کو تشنج میں مبتلا کر کے ختم کرتا ہے۔ فوجی لحاظ سے یہ کام پسندیدہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کے باعث موتیں واقع ہونے سے دشمن کی ہمت پست ہو جاتی ہے۔ ابتدا میں دونوں سائنس دان پس و پیش کرتے ہیں۔ خصوصاً اس لئے کہ برسر پیکار دونوں ممالک کے لوگ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن شہر متق کی مذہبی مجلس معلیٰ فتویٰ جاری کر کے یہ اعلان کرتی ہے کہ دشمن ملک کافر ہے۔ اس کے ساتھ ہی شہر داد بارغ کی ”مجلس متقیان و پرہیزگاراں“ اعلان کرتی ہے کہ اس دنیا میں بدی کے حامیوں

کوئی النار کرنے والوں کے لئے جنت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ دوسری صبح سائنس دان ”ج“ اور سائنس دان ”ڈ“ پیٹ بھرنا شتہ کرنے کے بعد ضمیر کی شہم بھر ملامت کئے بغیر اپنی تجربہ گاہ جا کر ڈفنکلو ٹیٹر اسائن کا امتزاج تیار کرنے میں جت جاتے ہیں۔

ضیاء الدین سردار

آج کے بنیاد پرست اپنے آپ کو جدید سائنس کے شہباز سے لڑنے والے مولے سمجھتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جدید سائنس کی عظیم عمارت کو ڈھا کر اس کی جگہ ایک ایسی عمارت تعمیر کرنے کا مطالعہ کرنا جس کا نقشہ بھی ہنوز تیار نہیں ہے بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تاہم یہ دلیری کلی طور پر قابل ستائش بھی نہیں ہے۔ ایمان کی تلوار سے لیس عقلیت سے محروم مولوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو سائنس دان ہیں اور جنہیں یہ اندازہ ہے کہ انہوں نے کتنے زیادہ مشکل کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ایسے افراد زیادہ تر سائنسی تعلیم سے نابلد ہیں اور ان میں سے کوئی ایسا شخص نہیں جس نے سائنس کے شعبہ میں امتیازی مقام حاصل کیا ہو۔ لیکن اس چھوٹی سی بات سے ان لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی، پھر بھی ان کے ذہن شکوک و شبہات سے خالی ہیں۔

عام طور پر وہ لوگ جو مذہب پرستی پر مبنی سائنس کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ اپنے مقدمہ کا آغاز جدید سائنس پر اس تنقید سے کرتے ہیں کہ سائنس اقدار سے عاری ہے۔ بعض ایجادات اور دریافتوں کے تباہ کن رخ کو اجاگر کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ جدید سائنس کے بروئے کار آنے سے معاشرہ غیر انسانی اور ”روبوٹی“ ہو گیا ہے۔ یہ نہایت سنگین اور جائز اعتراضات ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ تنقید کسی خاص دین یا مذہب کے گہرے مطالعے سے اخذ کی گئی ہو۔ یہ حقیقت کہ جدید سائنس نے انسانی معاشرے کو بعض سنگین مسائل سے دوچار کر دیا ہے مذہبی بنیاد پرستوں کی دریافت نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صنعتی تہذیب کی سائنس کے سب سے بڑے معترض ایبل، کوہن مارکیوز، کوہن فیراپینڈ اور دیگر مارکیس دانشور ہیں۔

جدید سائنس کے عفریت کو تہہ تیغ کرنے کے بعد بہادر مولے اپنا جہاد جاری رکھتے ہیں۔ سائنس کے متعلق ایسے مجاہد کا اپنا ایک تصور ہے جو اس کے خیال میں صحیح طور پر خدائی احکام

کے مطابق ہے۔ ہم پروفیسر نصر کے پیش کردہ ”اسلامی سائنس“ کے نظریے کا پہلے ہی مطالعہ کر چکے ہیں۔ اسلامی سائنس کے متعلق ضیاء الدین سردار نے بھی اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔ ضیاء الدین سردار پاکستانی نژاد اور برطانوی شہری ہیں۔ انہوں نے اسلام اور سائنس پر آدھی درجن کتابیں لکھی ہیں۔

"Why Islam Needs Islamic Science" کے عنوان سے "New Scientist" کے رسالے میں سردار کا ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اس امر پر زور دیا ہے کہ اسلامی سائنس کی تلاش عہد حاضر کے مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ ہے کیونکہ مغربی سائنس نہ صرف اپنی تباہ کاریوں کے باعث بلکہ اسلامی نظریے کے خلاف علیت کی وجہ سے بھی نامناسب ہے۔

"اسلامی سائنس" کے متعلق سردار صاحب کے اپنے نظریے سے قطع نظر یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ اسلامی سائنس کے دوسرے مبلغوں کے نظریات سے چنداں خوش نہیں ہیں۔ وہ الفاروقی (مرحوم) پر اعتراض کرتے ہیں۔ الفاروقی انتہائی قدامت پسند مسلمان اور سائنس کو اسلامی بنانے کے نہایت با اثر مبلغ تھے۔ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ علم کو اسلامی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ جدید دور کے ہر شعبہ علم سے اسلام کی خصوصی مطابقت قائم کی جائے۔ سردار کے نزدیک یہ بات گاڑی کو گھوڑے کے آگے رکھنے کے مترادف ہے کیونکہ ”اسلام کو جدید علم کے مطابق ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ جدید علم کو اسلام کے مطابق ہونے کی ضرورت ہے“۔ الفاروقی کے طریق کار کو محض عقیدے کا متقیانہ بیان قرار دے کر سردار کہتے ہیں کہ ”بد قسمتی سے الفاروقی کا طریق کار نہ ہونے کے برابر ہے“۔ البتہ اسلامی سائنس کے متعلق حسین نصر کے نظریات عمومی تعریف کے قابل ہیں۔ تاہم سردار کے نزدیک نصر ”اسلامی سائنس کے مادی پہلو کی قیمت پر مابعد الطبیعیاتی پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں“۔

"اسلامی سائنس" کے حق میں دفتر کے دفتر لکھنے کے باوجود سردار نے ایسا کوئی اضافہ نہیں کیا جو اس مبہم اصطلاح کے معنی واضح کرتا ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی دس بنیادی اسلامی اقدار سے متعلق ہیں۔ ان اقدار میں توحید، عبادات اور خلافت بھی شامل ہیں۔ مزید یہ

کہ اسلام سائنس برائے سائنس اور ظالم سائنس نیز ٹیکنالوجی کے خلاف ہے۔ اگر سردار صاحب سے قاری مہمل اور عامیانہ باتوں کے علاوہ کی توقع کرے گا تو اسے مایوسی ہوگی۔ سردار صاحب کی تحریریں جدید سائنس کی لفاظیات اور ظاہری چمک و دمک (لیکن اس کی منطقی معقولیت کے بغیر) کے سہارے بڑی بلند پروازیں کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر کمپیوٹر کی مانند سات خاکوں اور لاتعداد چارٹوں وغیرہ کی مدد سے انہوں نے ”امران منصوبہ“ بنایا ہے۔ یہ منصوبہ بقول ان کے ”مسلم نظام کی کلی اصلاح کر کے مسلمانوں کو اکیسویں صدی میں داخلے کے لئے تیار کرے گا۔ اس منصوبے کا فلو چارٹ ایک خاکے سے شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ”ریاست مدینہ کا نمونہ“ ہے اور جس خاکے پر اس کا اختتام ہوتا ہے اس کا عجیب عنوان ”Muslim Pay Off“ (مسلم حاصل یا ادائیگی) ہے جس میں Pay Off یا حاصل برابر ہے مستقبل کے لئے اختیاری کاموں کے حصول کے منصوبوں یا اندازوں کے اگر حروف و کلمات کی خوبصورتی ہی پر منصوبوں کی کامیابی کا انحصار ہوتا تو امران کا منصوبہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہا ہوتا۔ لیکن افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ٹھوس حقائق پر مبنی خیالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن سے امران عاری ہے۔ چنانچہ اس منصوبے کا مستقبل تاریک ہے۔

نصر اور سردار جیسے افراد کی تجاویز کے مخصوص محاسن یا عیوب کچھ بھی ہوں، ہمیں ایک عام سوال کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو یہ ہے کہ کیا مادی دنیا کے متعلق اسلامی سائنس کا وجود ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ہم نظریات اور سائنس سے بحث کر رہے ہیں اس لئے یہ سوال پوچھنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کیا عام ”مغربی“ یا ”سرمایہ دارانہ“ سائنس سے مختلف کسی مخصوص مارکسی سائنس کا وجود ہو سکتا ہے۔ آئیے ہم ان سوالوں پر غور کریں۔۔۔۔۔۔

باب سات

کیا سائنس اسلامی بھی ہو سکتی ہے؟

میری رائے میں اس سوال کا سادہ اور دو ٹوک جواب یہ ہے کہ نہیں! مادی دنیا کے متعلق مخصوص اسلامی سائنس ممکن نہیں ہے اور ایسی سائنس کو تخلیق کرنے کی کوشش بے کار ہوگی۔ اس جواب سے اسلام کی تضحیک نہیں ہوتی۔ سرسید احمد خاں کی یہ دلیل آج بھی صحیح ہے کہ مذہب کا مقصد سائنسی حقائق کی نشاندہی نہیں بلکہ اخلاقیات کی اصلاح ہے۔ اب میں اپنے اس بیان کے حق میں دلائل دوں گا کہ مذہبی اصولوں کی بنیاد پر نئی مادی یا طبعی سائنس تخلیق کرنے کی کوشش کس لئے لا حاصل ہوگی۔

دلیل اول: اسلامی سائنس کا کوئی وجود نہیں اور اسلامی سائنس تخلیق کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوئی ہیں۔ حالانکہ کچھ مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی سائنس جیسی چیز وجود رکھتی ہے مگر حقیقت اس سے مختلف ہے بے شمار کافر نسوں اور کوششوں کے باوجود آج تک اسلامی سائنس کی کوئی ٹھوس شکل نمودار نہیں ہو سکی۔

اس کے برعکس جدید سائنس کا واضح اور محسوس ہونے والا وجود ہے۔ اس کے بغیر کارخانے نہیں چل سکتے، فوجیں لڑ نہیں سکتیں اور بیماریوں کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کی بدولت ایک آدمی

کی تصویر ایک پل میں ہزاروں میل دور تک دیکھی جاسکتی ہے؛ جیٹ ہوائی جہاز اڑ کر براعظموں کو پار کر سکتے ہیں؛ بیمار دل کی جگہ مٹینی دل لگایا جاسکتا ہے اور تجربہ گاہ میں پودوں اور جانوروں کی نئی نسلی اقسام پیدا کی جاسکتی ہیں۔ صنعتی معاشرے میں سائنس افراد کی زندگیوں پر حاوی ہے؛ یہ دنیا کے متعلق ان کے نقطہ نگاہ اور ان کے سوچنے کی عادتوں کی تشکیل کرتی ہے اور انسانی رشتوں میں بھی دخل ہے۔ بعض صورتوں میں سائنس کا ضرورت سے زیادہ غلبہ اور دخل قابل مذمت ہے؛ لیکن بعض شعبوں میں یہ خوش آئند اور بابرکت بھی ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جدید سائنس کی طاقت عظیم اور حقیقی ہے۔

جہاں تک اسلامی سائنس کا تعلق ہے؛ اس نام کی ایسی سائنس تخلیق کرنے کی کوشش؛ جو نئی علمیات کی حامل ہو؛ برابر ناکام ہوتی رہی ہے۔ گو کہ گزشتہ چند دہائیوں سے اس کی ضرورت کو منوانے کے لئے جذباتی دلائل سے کام لیا گیا ہے اور اس موضوع پر متعدد بین الاقوامی کانفرنسیں بھی منعقد کی گئی ہیں۔ ان مباحث میں صحیح مواد نہیں تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے؛ اسلامی سائنس نے ایک بھی مشین یا اوزار نہیں بنایا۔ نئے کیمیاوی مرکبات یا ادویہ کا استخراج تیار نہیں کیا؛ کسی نئے تجربے کا ڈیزائن نہیں بنایا۔ تاحال کوئی نامعلوم حقیقت دریافت نہیں کی۔ اس کی بجائے اسلامی سائنس کے دعوے داروں نے اپنی تحقیق کا رخ ایسے مسائل کی طرف موڑا ہوا ہے؛ جو عام سائنس کے میدان سے باہر ہیں۔ یہ مسائل ایسے ناقابل آزمائش معاملات سے متعلق ہیں جیسے رفتار فلک؛ دوزخ کا درجہ حرارت؛ جنات کی کیمیاوی ساخت؛ منافقت کا حساب لگنے کا فارمولہ؛ پیغمبر ﷺ کے واقعہ معراج کی نظریہ اضافیت پر مبنی تشریح اور دیگر کئی مثالیں جن کا تفصیلی تذکرہ آخری باب میں ہے؛ بیان کی گئی ہیں۔

کیا اسلامی سائنس کی یہ نام نہاد دریافتیں دین اسلام کے مطابق ہیں؟ میرے خیال میں اسلام ایسی موٹو گائیڈ کی اجازت نہیں دیتا۔ جہاں تک سائنس کے عام معیار کا تعلق ہے؛ یہ دریافتیں اس پر پوری نہیں اترتیں۔

دلیل دوم: اخلاقی اور مذہبی اصول وضع کرنے سے خواہ وہ اصول کتنے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں؛ کوئی نئی سائنس وجود میں نہیں آسکتی۔

فرض کیجئے کہ سائنس دان ”الف“ خدا کی وحدت میں یقین رکھتا ہے؛ سائنس دان ”ب“ کئی

دیوتاؤں کو مانتا ہے ارسائنس دان ”ج“ ملد ہے۔ ان تینوں کا شعبہ تحقیق ابتدائی ذرات کی طبیعیات ہے جو کہ نہایت مشکل اور ریاضیاتی شعبہ ہے ان کے مختلف عقائد ہونے کے باوجود ان تینوں سائنس دانوں کا پیشہ ورانہ کام صرف ایک معیار پر جانچا جائے گا اور وہ معیار یہ ہے کہ آیا ان کے نتائج تجربہ کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ میں پروفیسر عبدالسلام اور اسٹیون واٹن برگ کی مثال پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔ ان دونوں کو 1979ء میں طبیعیات کا نوبل انعام ملا۔ کیونکہ انہوں نے قدرتی طور پر پائی جانے والی کمزور اور برقی مقناطیسی قوتوں کو متحد کیا تھا۔ عبدالسلام سخت مذہبی ہیں اور واٹن برگ اعلانیہ ملحد ہیں۔ یہ دونوں اعتقادات اور جغرافیائی مقامات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ اس کے باوجود وہ سائنسی تحقیق کے ذریعہ ایک ہی حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ایک خاص قسم کی سائنس کی اجارہ داری قائم کرنے کا حکم ناقابل عمل ہے کیونکہ سائنس کی اپنی ایک داخلی منطق ہوتی ہے۔ جس کو خارجی عوامل تبدیل نہیں کر سکتے۔ سائنس دان کے پاس بھی بعض اوقات کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر گلیلیو اور نیوٹن دونوں ہی یکے عیسائی تھے اور ان کی یہ خواہش نہیں تھی کہ رائج الوقت اعتقادات کو بدل ڈالیں۔ اکثر اوقات نیوٹن عیسائی اعتقادات اور سائنسی دریافت کے درمیان تضاد کے باعث عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ لیکن اس نے حقیقت کا انتخاب کیا۔ آخر کار ان دونوں سائنس دانوں کی دریافتوں نے سائنسی ارتقا کی ایسی طوفانی لہر پیدا کی، جس نے کلیسا کے کئی اختیارات ختم کر دیئے۔ اگر نیوٹن کو معلوم ہوتا کہ اس کی دریافتوں کا یہ اثر مرتب ہوگا تو شاید وہ اپنی کتاب ”Principia“ شائع نہ کرتا۔

اس کے باوجود کہ نظریاتی اصول اور سیاسی محرکات فراہم کئے گئے ہیں اور کئی کوششیں بھی کی گئی ہیں، لیکن عملاً ”اسلامی سائنس“ کی تعریف ناممکن ثابت ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر اس بات پر غور کیجئے کہ جنرل ضیاء کی حکومت کے دور میں سائنس کی تعلیم کو اسلامی بنانے کے مقصد کا کئی بار اعادہ کیا گیا، عالموں اور سائنس دانوں کی کئی جماعتیں بنائی گئیں اور ان کے بے شمار جلسے ہوئے، لیکن گیارہ سالہ کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس سائنس کا نصاب کیا ہے جس کو اسلامی بنایا گیا ہو؟ آج تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور سائنس کو اسلامی بنانے

کے حق میں جو لوگ ہیں، وہ اس مسئلہ پر بحث کرنے سے کتراتے ہیں۔ اس کوشش کی فاش ناکامی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نظر یہ ارتقا پر بھرپور حملہ کر کے اسے انٹرنیشنل اسلام سائنس کے نصاب سے خارج کرانے کے منفی قدم کے علاوہ کوئی اور مثبت کام اسلامی سائنس کے حامی نہ کر سکے اور 1977ء سے اب تک سائنس کا نصاب وہی چلا آ رہا ہے جو اس سے پہلے تھا۔ لیکن سائنس کو اسلامی بنانے کی کوشش نے سائنس کی تعلیم کے معیار اور تعلیمی نظام (جو پہلے بھی چنداں بہتر نہیں تھا) کو جو نقصان پہنچایا ہے، انہیں پچھلے معیار پر لانے کے لئے بھی کئی برسوں کی صبر آزمائش درکار ہوگی۔

جنرل ضیاء کے دور حکومت میں سائنس کو اسلامی بنانے کی جو کوششیں کی گئیں، ان کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ پہلا سنجیدہ اشارہ 1982ء کا وہ سرکاری اعلان تھا جس کے تحت تمام علوم بشمول سائنس کو بہت جلد اسلامی بنایا جانا تھا۔ یہ اعلان 1982ء کے اوائل میں اس موقع پر کیا گیا جبکہ اسلام آباد میں پاکستان کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اور امریکہ کے انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھٹ کے اشتراک سے منعقدہ مجلس مذاکرہ کا افتتاح جنرل ضیاء نے کیا۔ علم کو اسلامی بنانے کے متعلق کلیدی خطبہ اسلامی یونیورسٹی کے ریکٹر جناب اے۔ کے۔ بروہی نے دیا۔ جناب بروہی کے متعلق یہ بتانا ضروری ہے کہ وہ پرانے انگلش کتب خیال کے نہایت اچھے وکیل تھے۔ 1977ء میں مارشل لاء حکومت کے بعد وہ ایک قومی شخصیت کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ان کی شہرت کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے عدالت عظمیٰ کو ”نظر یہ ضرورت“ کی ایجاد میں مدد دی۔ اس نظریے کی رو سے فوجی حکومت جائز اور ناگزیر تھی کیونکہ یہ ملک کو طوائف الملوکی اور انتشار سے بچانے کے لئے قابض ہوئی تھی۔ فوجی حکومت کی خدمات کے اعتراف میں جناب بروہی کو 1987ء میں فوٹ ہونے پر پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ڈن کیا گیا۔

مجلس مذاکرہ میں اپنے کلیدی خطبہ میں جناب بروہی نے اس ”مشکوٰۃ“ حصہ کی کوئی تعریف نہیں کی جو ”عصر حاضر کی فکر میں شامل کیا گیا ہے اور جس کا اظہار طبیعیات اور کیمیا جیسی سائنسوں میں ہوا ہے“۔ ان کی تنقید کا خاص نشانہ وہ کتب تھیں جو نصاب میں شامل کی گئی ہیں کیونکہ ان کتابوں کے ”صفحات پر سربر آوردہ غیر مذہبی مفکروں، مثلاً ڈارون، فرائڈ، کارل

مارکس کی تحقیقات کے انمنٹ نشانات موجود ہیں۔“

جناب بروہی کے خیال میں آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت قابل اعتراض اور خلاف اسلام

ہے۔

”میری سوچی سمجھی رائے میں اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو متحرک ذرات اور مادے کے بنیادی اجزاء کے متعلق آئن سٹائن کے نظریات باطل ہیں۔“

جناب بروہی صاحب کوئی ماہر طبیعیات تو تھے نہیں اور وہ ریاضی کے اس علم سے بھی نا آشنا تھے جس کے بغیر آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کو چیلنج تو کیا سمجھا بھی نہیں جاسکتا۔ ایک عام آدمی تو ایسے دقیق مسائل پر تبصرہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ لیکن بروہی صاحب نے اس عیسائی پادری کے نقش قدم پر چلنا پسند کیا جس نے انجیل کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ کائنات کی ابتدا صبح نو بجے بروز اتوار 23 اکتوبر 4004 قبل مسیح کو ہوئی تھی ان حضرت کی طرح بروہی صاحب بھی اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ ان کے نظریہ دین کو سائنسی اصولوں پر فوقیت حاصل ہے۔

ایک اور اعادہ اس نظریے کا کہ سائنس کو مذہب کے تابع ہونا چاہیے ڈاکٹر ایم۔ اے قاضی نے کیا جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے صدارتی مشیر تھے۔ لیکن اس اعلیٰ عہدے نے بھی جناب قاضی کو جدید سائنس کے طریق کار کی مخالفت سے نہیں روکا۔ ایک تقریر میں جس کا عنوان ”جدید سائنسی علم کو اسلامی بنانا“ تھا جناب قاضی نے کہا کہ تمام درجوں کے لئے سائنس کی نئی نصاب کتب کا اس طرح لکھا جانا ضروری ہے کہ ”جب کبھی ہم کسی سائنسی نظریے یا اصول کو دستیاب حقائق اور استدلال کی بنیاد پر ثابت کرنا چاہیں، ہم قرآن و سنت کے حوالوں سے ثبوت بھی فراہم کر سکیں۔“

جن لوگوں نے ”اسلامی سائنس“ کی تعریف کرنے کا مصمم ارادہ کر ہی لیا ہے ان کو یہ حقیقت اس کوشش سے باز نہیں رکھ سکتی کہ اس سلسلہ میں گزشتہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ ایسے آئندہ لوگ بھی کوششیں جاری رکھیں گے۔

دلیل سوم: اسلامی سائنس کی ایسی تعریف جو تمام مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آج ہے۔

اسلامی دنیا میں سائنسی اور علمی ترقی اور کامیابیوں کے سنہری دور میں بھی اس سوال پر سخت اختلاف تھا کہ صحیح سائنس کیا ہے۔ ابن سینا، ابن الہشیم اور ابن رشد جیسے حقیقت پسندوں اور اشعری مکتب خیال کے درمیان اس سلسلہ میں مستقل تنازعہ رہا۔ یہ سائنس کی خوش قسمتی تھی کہ صدیوں تک عقلیت پسندوں کا پلہ بھاری رہا۔

موجودہ دور میں فرقہ وارانہ مسائل اتنے ہی سنگین ہیں جتنے کہ ماضی میں تھے۔ ان مسائل میں مسلم مملکتوں کے درمیان قومی تنازعات گویا اضافہ ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ حالیہ برسوں میں ایران نے اسلامی سائنس پر تمام کانفرنسوں کا بائیکاٹ کیا ہے۔ ان حالات میں اسلامی سائنس کی نیچر کے سوال پر آراء کی مطابقت کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔

مفروضہ اسلامی ٹیکنالوجی کے مسائل اسلامی سائنس کے مسائل سے مشکل نہیں ہیں۔ سید حسین نصر جیسے خیالی گھوڑے دوڑانے والے لوگ ہمیں یہ یقین دلانا چاہیں گے کہ گزشتہ صدیوں میں اہلیت کے باوجود مسلمانوں نے پیچیدہ مشینیں یا جدید توپیں اور بندوقیں اس لئے نہیں بنائیں کہ ان کے بنانے سے انسان اور نیچر کے درمیان نازک توازن بگڑ جاتا اور انسانی وجود کی روحانی صفات کم ہو جاتیں۔ اگر اس بات کو سچ مان لیا جائے تو بھی سائنس کے متعلق اس قسم کا راہبانہ زاویہ نگاہ آج کی دنیا کے مسلمانوں کی اکثریت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہر قسم کی پیچیدہ مشینیں اور جدید ترین اسلحہ چاہتی ہے۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ مسلم مملکتوں کے ہاتھوں ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا استعمال غیر مسلم مملکتوں سے بہت مختلف ہوگا۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ حالیہ جنگ میں ایران اور عراق کے پاس ایٹمی بم نہیں تھے۔

گو ہماری دلچسپی اسلامی سائنس کے مسئلہ پر مرکوز ہے۔ لیکن سائنس کا دیگر نظریات سے مقابلہ کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کیا مارکسی سائنس ہے یا ہو سکتی ہے؟

گو کہ ہمارا موضوع اسلامی سائنس ہے، تاہم ایک مختلف سیاق و سباق میں نظریے سے سائنس کی معرکہ آرائی کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1930ء سے 1960ء کے عرصہ میں مارکسی فلسفے سے متاثر ہو کر روسی سائنس دانوں کی ایک

بڑی تعداد نیز چند مغربی سائنس دانوں نے طبعی دنیا کے متعلق ایسی سائنس تلاش کرنے کی کوشش کی جو جدلیاتی مادیت کی علمیات پر مبنی ہو۔ اینیگلز کی جدلیات (Dialectics of Nature) اور لینن کی ”مادیت اور تجرباتی تنقید“ (Materialism and EmpirioCriticism) کی روشنی میں انہوں نے سرمایہ دار معاشرے میں رائج سائنس سے ممتاز اور برتر ”مارکسی“ سائنس کو تخلیق کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے جدلیاتی مادیت کے طریق ارتقا یعنی دعویٰ (Thesis) ضد دعویٰ (Anti-Thesis) اور امتزاج (Synthesis) کا طبعی سائنس کے مختلف شعبوں، مثلاً کوٹم میکانیات، اضافیت اور جینیات (Genetics) پر اطلاق کر کے یہ تصدیق کرنی چاہی کہ سائنس بھی جدلیاتی مادیت کے اصولوں پر چلتی ہے۔

اشتراکی سائنس تخلیق کرنے کی یہ کوشش صرف ناکامی پر نہیں بلکہ شرمناک ذلت پر منتج ہوئی۔ اس کی کلاسیکی مثال لائینکو کی ”اشتراکی“ حیاتیات ہے جس کا نظریہ اسٹالن کے دور میں پیش کیا گیا۔ اشتراکی مکتب خیال کی تاریخ میں اس نظریے کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ اس کی موافقت اور مخالفت میں لاتعداد کتابیں لکھی گئیں۔ مندرجہ ذیل سطروں میں حقائق کا صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

لائینکو کا شکار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ پودوں کی پرورش کرتا تھا۔ حیاتیات کے شعبہ سائنس میں 1930ء کی دہائی میں اس کا نام سامنے آیا۔ اس نے حیاتیات میں ماہرین جینیات کے کام کو چیلنج کیا۔ یہ تمام ماہرین اونچے طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ لائینکو کے سائنسی دعاوی طبقاتی کشمکش اور جدلیاتی مادیت کی اصطلاحات یا لفظیات میں بیان کئے گئے تھے، اس لئے اسٹالن کے دور میں ان کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور سوویت مملکت نے اس کی حیاتیات کو کمیونسٹ یا مارکسی سائنس تسلیم کر لیا۔ جلد ہی لائینکو کے حامیوں نے مملکت کے دہشت پھیلانے والے اداروں سے گھ جوڑ کر کے سائنس کے شعبہ میں اپنے مخالفین کو با اختیار عہدوں سے ہٹانا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں نکولائی واوی لاف کا معاملہ بہت مشہور ہوا۔ وہ نباتاتی جینیات کے اولین سائنس دانوں میں سے ایک تھا۔ اس کے رجحانات اشتراکی تھے۔ ایک فوجی عدالت نے زراعتی تباہی اور دیگر الزامات لگا کر اسے موت کی سزا سنائی۔ گو

بعد میں سزائے موت کو دس سال کی قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ واوی لاف تین سال کی قید کاٹ کر جیل میں ہی مر گیا۔

لائسنکو نے مبہم دلائل اور غلط اعداد و شمار کی بنیاد پر مینڈیلین جینیات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ نسلی وراثت موروثی ساخت سے نہیں بلکہ کسی جاندار اور ماحول کے درمیان باہمی تفاعل سے متعین ہوتی ہے۔ جاندار زندگی کے تجربات و اثرات اپنی آئندہ نسلوں کو منتقل کرتا ہے۔ اس کا ایک قدرتی ضمنی کلیہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ انسان اپنا تعین آپ کرتا ہے۔ یہ اشتراکی زاویہ نگاہ سے ایک نہایت خوش کن دعویٰ ہے۔ لیکن حیاتیات کے سائنس دان بے شمار وقیح شہادتوں سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اکتسابی خصوصیات یا صفات آئندہ نسل کو منتقل نہیں ہوتیں اور لائسنکو کا دعویٰ بالکل غلط ہے۔ لائسنکو کا ایک اور جھوٹا دعویٰ یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے پودے آپس میں ”اشتراکی بچتی“ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان کے درمیان تنازع البقاء (زندگی کے لئے مقابلہ) نہیں ہوتا۔ اس نے یہ بات بھی اصرار کے ساتھ کہی کہ ایک ہی قبیل کے درختوں کو قریب قریب بودیا جائے تو وہ نشوونما میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ اس غلط نظریے کی روسے روس میں جنگلات کی کاشت اور صنعت کو بہت نقصان پہنچا۔

لائسنکو نے سوویت یونین میں حیاتیات کی سائنس کو تقریباً بیس سال پیچھے دھکیل دیا۔ مخالفین پر ظلم کرا کر انسانیت کے دکھ میں اضافہ کیا اور سوویت زراعت و جنگلات کو نقصان پہنچایا۔ لائسنکو کے نظریات کا زوال خروشیف کے دور سے شروع ہوا۔ حسب توقع اشتراکیت کے مخالفوں نے لائسنکو کے نظریات کی ناکامی کو یہ ثابت کرنے کے لئے استعمال کیا کہ مارکسیت غیر منطقی نیز جبریت پر مبنی فلسفہ ہے۔

لائسنکو کے متعلق اشتراکیوں کی آراء مختلف تھیں۔ ایک طرف وہ ماؤ کے حامی لوگ تھے جو روس میں اس کو ترک کرنے کے بعد بھی اسے اینگلز کی جدلیت کا اعلیٰ ترین حاصل کہتے رہے اور روسی کمیونسٹ پارٹی کو اس وجہ سے مارکسیت کا منحرف قرار دیتے رہے کہ اس نے لائسنکو کے نظریات کی مذمت کی تھی۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ کیا مادی حالات تھے (مثلاً روسی زراعت کی خراب حالت اور اسٹالن کی رائج کردہ اجتماعی زراعت

یا مشترکہ کھیتی باڑی کی ناکامی) جن کی وجہ سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کو فوراً حل کرنے کے لئے لائسنسکو کے احتمقانہ نظریات بھی قبول کر لئے گئے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے لائسنسکو کو ایک ایسے جاہ طلب اور موقع پرست فرد سے زیادہ وقعت نہ دی جو عموماً آمریت کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔ کیونکہ یہ شخص ایک انفرادی معاملہ تھا، لہذا اس کی کوئی مستقل اہمیت نہیں ہو سکتی۔

لیکن لائسنسکو کے قصے کو اتنا غیر اہم بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ بے شک یہ مارکسی سائنس کی سب سے زیادہ ذلت آمیز مثال تھی لیکن اس کے علاوہ بھی چند مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اسٹالن کے روس میں کوٹلم میکانیات اپنی احتمالی نیچر کے باعث اور آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت فلسفیانہ معنویت کے سبب نظریاتی اعتبار سے مشکوک تھے۔

مندرجہ بالا منفی تجربات نے ترقی پسند سائنس دانوں کو اس غلط خیال سے نجات دلائی کہ قدرت کسی خاص نظریے یا اعتقاد کی پابند ہے یا ہو سکتی ہے۔ جہاں تک سائنس کے استعمال کا تعلق ہے سو وہ ایک مختلف مسئلہ ہے۔

تیسری دنیا کی سائنس؟

تیسری دنیا کی قومیں دنیا کی آبادی کا تین چوتھائی سے زیادہ ہیں۔ لیکن دنیا کی کل پیداوار کا بیس فیصد سے کم کماتی ہیں اور دنیا کے قدرتی وسائل کا صرف بائیس فیصد صرف کرتی ہیں۔ صنعتی ملکوں پر ان کا انحصار زندگی کے ہر شعبے سے ظاہر ہے۔ یہ انحصار اقتصادی شعبے میں اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ 1989ء میں صنعتی ملکوں کے بینکوں کو تیسری دنیا کے ملکوں نے قرضوں پر سود کے طور پر 150 ارب ڈالر کی خطیر رقم ادا کی ہے۔ صنعتی ملکوں کے اپنے مفادات کا انحصار ایسی حکمت عملیوں کے ذریعہ ہوتا ہے جو کئی اعتبارات سے تیسری دنیا کے ملکوں کے لئے تباہ کن ہیں۔ مثال کے طور پر تیسری دنیا کی اشرافیہ کے اندر دانستہ طور پر درآمدی ساز و سامان کی ہوس پیدا کی جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کے فوجی صنعتی کارخانوں میں تیار کئے گئے نفیس اسلحہ سے ان کی فوجی مہم جوئی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بیرونی ملکوں کی تجارتی و صنعتی کمپنیاں تیسری دنیا کے وسائل لوٹتی ہیں، منافع کے لئے جنگلات کو کاٹتی ہیں اور دریاؤں کو آلودہ کرتی ہیں۔ کئی ملکوں میں زہریلے کیمیاوی فضلے پھینکے جاتے ہیں، کیڑے مار دوائیں

مقامی ماحول اور حیات کو نقصان پہنچاتی ہیں اور بھوپال جیسی تباہ کاری کا ظلم بھی ان پر توڑا جاتا ہے۔

یہ حقائق ان لوگوں کے لئے پریشان کن ہیں جو دنیا میں انصاف چاہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے تیسری دنیا میں بشمول سائنس ان تمام چیزوں کے خلاف ایک رد عمل ہوا ہے جن کو مغربی سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے تیسری دنیا میں سائنس ترک کرنے کے حق میں مختلف دلائل دیئے جا رہے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ تیسری دنیا میں جو سائنس رائج ہے وہ اصلی اور تخلیقی نہیں ہے اور یہ زیادہ تر تیسری دنیا کے معاشرے سے علیحدہ ہی رہتی ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے نہیں تو ہیئت کے لحاظ سے تیسری دنیا میں سائنس اس سائنس سے مختلف نہیں ہے جو مغرب میں رائج ہے اس لئے یہ سائنس نوآبادیاتی دور سے پہلے کے علوم اور فلسفوں کی روح سے میل نہیں کھاتی۔ چنانچہ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ سائنس نوآبادیاتی نظام کا لگایا ہوا پودا ہے اس لئے یہ غیر مغربی ملکوں میں پروان نہیں چڑھ سکتا۔

کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کو ایک نئی ”تیسری دنیا کی سائنس“ درکار ہے؟ بعض لوگ اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کی سائنس کا ایک بہت بڑا مبلغ سری لنکا کا دانشور سونا تنھا گونا تلکے ہے۔ اسلامی دنیا میں نصر اور سردار جیسے ہم عصروں کی طرح گونا تلکے بھی یہ سمجھتا ہے کہ عقل و خرد کا صحیح منبع عہد عتیق یا ماضی بعید میں ہے۔ اس میں اور اسلامی دانشوروں میں فرق یہ ہے کہ وہ اس منبع کو اسلامی عہد کے بجائے جنوبی ایشیا میں نوآبادیاتی دور سے پہلے کی تہذیب میں تلاش کرتا ہے۔ نصر اور سردار کی طرح گونائی لاکے کو بھی یقین ہے کہ جدید سائنس تیزی سے تباہی کی طرف جا رہی ہے اور صرف پرانی تہذیبوں میں ہی وہ دانش ہے جو اسے تباہی سے بچا سکتی ہے۔ اس طرح طب کے شعبہ میں ”نئے“ ترقیاتی نکات کے لئے آیور ویدک ماضی کی چھان بین کر کے ہم عصر سائنسی علم سے اس کا امتزاج کیا جا سکتا ہے اور جنوبی ایشیا یا چین جیسے ملکوں کی سیر حاصل تاریخی سائنسی اور فکری روایات میں نیوکلیائی طبیعیات اور علم کائنات کے لئے نئی جہتیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو گونا تلکے کے بقول تیسری دنیا کے لوگ ایسی سائنس کی نقالی کرتے رہیں گے جس کا مرکز مغرب میں ہے۔

تیسری دنیا کی سائنس کے دوسرے حامی بھی ملتے جلتے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں سے چند 1986ء میں پینانگ میں منعقدہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں جمع ہوئے۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا ”جدید سائنس کا بحران“۔ اس کانفرنس نے اعلان کیا کہ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی مغربی تجربہ اور علمیات پر مبنی ہیں؛ اس لئے تیسری دنیا کی ضروریات کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ چنانچہ یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ جدوجہد کا سب سے زیادہ مشکل کام پہلی دنیا کے اثر و نفوذ سے تیسری دنیا کے دماغوں کو پاک کرنا ہے اور ایسے بیرونی تربیت یافتہ سائنس دانوں کے خلاف لڑنا ہے جو ”اس مغربی وائرس کے سب سے بڑے جراثیم بردار ہیں؛ جس سے ہم اپنے معاشروں کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں“۔

گو سیاست پر مبنی سائنس کے مقاصد مذہب پر مبنی سائنس کے مقاصد سے مختلف ہیں؛ میری رائے میں دونوں ہی غلط ہیں۔ آخر الذکر پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں؛ وہ اول الذکر پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ ایسی کسی سائنس کا وجود نہیں؛ ایسی سائنس کے لئے جو بھی تجویز اب تک پیش کی گئی؛ وہ بہت زیادہ مبہم اور اکثر بذات خود متضاد تھی۔ چند افراد کے چھوٹے گروہ سے باہر اسے عام تائید حاصل نہیں اور اس گروہ کے اراکین کو سائنس سے کوئی واسطہ نہیں ہے اور سائنس کا یہ محدود تصور سائنس کی آفاقیت کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس باب میں ان دلائل کی پہلے ہی وضاحت کی جا چکی ہے؛ اس لئے مزید تشریح کی چنداں ضرورت نہیں۔

ان دلائل کی روشنی میں یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”تیسری دنیا کی سائنس“ ایک غلط تصور ہے؛ جس سے وقت کے ضیاع کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور جس پر عمل کر کے تیسری دنیا کی پستی؛ افلاس اور ماحول کی تباہی میں مزید اضافہ ہی ہو سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ٹیکنالوجی دنیا میں عام نہیں ہے۔ اس لئے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ گنجان آبادی کے معاشروں کے مخصوص تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ٹیکنالوجی میں تبدیلیاں کی جائیں اور تبدیل شدہ ٹیکنالوجی سے ان تقاضوں اور ضروریات کو پورا کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے سائنس کے وسائل پر قدرت حاصل کی جائے نہ کہ انہیں ترک کیا جائے۔ صرف ایسا کر کے ہی ہم آفاقی تہذیب کی بقا کے ضامن بن سکتے ہیں۔

ضروری تھی، جو استعمار پسندوں کے مفروضوں یا پروپیگنڈے کو مٹھلکوک بناتی ہو۔ جب مسلمانوں کو یہ یقین ہو گیا کہ مغربی تعلیمات میں مسلمانوں کے خلاف تعصب سے کام لیا جاتا ہے، تو انہوں نے اپنی علمی و ثقافتی تواریح میں عام مغربی مفروضوں کو غلط ثابت کرنے کے لئے تحقیق شروع کر دی۔ تاریخ کی خشک کتابوں سے ازمنہ و سطحی کی جو تاریخ برآمد ہوئی، وہ مسلمانوں کے شاندار ماضی کی ایک داستان ہے اور تمام دنیا میں مسلمانوں کے زندہ تصور کا ایک جزو ہے۔ خصوصاً قرون اولیٰ کی سائنسی کامیابیاں غیر معمولی اہمیت اور معنویت کی حامل ہیں۔ ہزار سالہ عہد گزرنے کے باوجود بعض لوگ سنجیدگی سے یہ سوچتے ہیں کہ وہ کتنی جس سے نئے نشاۃ ثانیہ کے دروازے کھل سکتے ہیں، ماضی کی تاریک راہوں میں کہیں پڑی ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ماضی میں کیا غلطی ہوئی ہے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مستقبل میں کیا کرنا چاہیے۔

اس وجہ سے گزشتہ دو سو سالوں سے مختلف نظریات رکھنے والوں کا ایک بڑا کام یہ رہا ہے کہ تہذیبی زوال کے اسباب کی نشاندہی کی جائے۔ لیکن جیسا کہ عموماً تاریخ کے متعلق مباحثوں میں ہوتا ہے، نتائج یا اسباق داخلی تعصبات یا دعاوی کی تصدیق یا تائید کے لئے اخذ کئے جاتے ہیں۔

کٹر احیا پسندوں کے زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو سنہری دور مسلمانوں کو متقی زندگی گزارنے کے انعام میں حاصل ہوا۔ جب تک وہ پابندی اور خلوص سے نمازیں پڑھتے رہے، رمضان کے مہینے میں روزے رکھتے رہے، زکوٰۃ دیتے رہے، حج ادا کرتے رہے اور دیگر تمام مذہبی فرائض سے کما حقہ سبکدوش ہوتے رہے، خوش حال رہے۔ اس کے برخلاف خلفاء کے دربار میں برائیوں اور لہو و لعب، مثلاً شراب نوشی، رقص و سرود اور زنا کاری کے باعث زوال شروع ہوا۔ اس زاویہ نگاہ کے مطابق ماضی کی شان و شوکت اور خوش حالی اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے اگر مسلمان شریعت پر عمل پیرا ہو جائیں اور مذہبی رسوم ادا کرنے لگیں، لیکن اس خیال کی مخالفت میں یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اسلامی تاریخ میں علمی ترقی خصوصاً ہارون الرشید اور مامون الرشید جیسے غیر راسخ العقیدہ اور رواداری برتنے والے خلفاء کے دور میں ہوئی۔ ان کی آزاد خیالی سے کٹر مولوی ناخوش تھے۔

کڑا حیا پسندوں کے برعکس نئی روشنی اور تعمیر نو کا حامی مسلمان ایک مختلف کردار اور منزل کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ ماضی میں مسلمانوں کی سائنسی کامیابیوں کی تاریخ پڑھ کر فوراً اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ کامیابیاں اسلام اور سائنس کے درمیان ہم آہنگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ اس کے بقول سنہری دور کا تصور قرآن حکیم اور رسول ﷺ کی بار بار کی گئی اس تلقین کا فاتحانہ جواز بن جاتا ہے کہ علم حاصل کرو اور علم حاصل کرنے کے اس حکم میں جدید سائنس کا حصول بھی شامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کی سات سو پچاس آیات (کتاب کا تقریباً آٹھواں حصہ) میں اہل ایمان کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ قدرت کا مطالعہ کریں یعنی مشاہدوں اور تجربوں پر مبنی جدید سائنس کے طریقے اپنائیں۔ مسلمانوں کے سنہری دور میں سائنسی کامیابی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کلی طور پر سائنس کا حامی ہے اس لئے سائنس پڑھنا اور سیکھنا مذہبی فریضہ بھی ہے اور دنیاوی ضرورت بھی۔

تعمیر نو کا حامی مسلمان کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب میں سائنس کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے مسلم سائنس کی تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ چند متنازعہ مسائل پر بحث کی جائے ان میں سے مندرجہ ذیل سوالات خصوصی اہمیت کے حامل ہیں:

☆ کیا مسلمانوں نے خاص طور پر اسلامی طرز کی سائنس کو ترقی دی تھی؟ کیا یہ سائنس آفاقی تھی اور اس لئے اس کو ”مسلم سائنس“ کہنا زیادہ مناسب ہوگا؟

☆ کیا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے سنہری دور میں جن لوگوں نے سائنس کو ترقی دی، وہ زیادہ تر غریب تھے؟ غیر مسلم اور غیر عرب دانش وروں کا رول کتنا اہم تھا؟

☆ کیا ازمنہ وسطیٰ کے مسلم معاشرے نے صحیح معنوں میں عقلی سائنسوں کو قبول اور جذب کر لیا تھا؟

اس باب کا بقیہ حصہ مندرجہ بالا سوالات پر غور و خوض کے لئے مختص ہے۔

یہ اسلامی سائنس تھی یا مسلم سائنس؟

یہ کوئی لفظی کج بحثی بھی نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے ازمنہ وسطیٰ میں جس سائنس کو پروان چڑھایا، کیا وہ خصوصاً اسلامی مذہبیات اور عقائد سے تعلق رکھتی تھی یا اس کی ترکیبیں اور مفروضے اصل میں وہی تھے جو دیگر انسانی تہذیبوں کے بھی تھے یا ہو سکتے تھے؟ گویا کہ اس

سوال کا جواب حاصل کرنا ہے کہ آیا مسلمانوں کے سنہری دور کی سائنس کو ”اسلامی سائنس“ کا نام دیا جائے یا ”مسلم سائنس“ کہا جائے۔

یہ مسئلہ اس وجہ سے اتنا زیادہ مبہم ہو گیا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ میں سائنس کا مطلب بالکل وہ نہیں تھا جو آج ہے۔ مثال کے طور پر الغزالی شریعت کے مطالعے کو سائنس کہتے ہیں لیکن اس لفظ کا جدید استعمال مختلف ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مختلف سائنسیں تھیں اور ازمنہ وسطیٰ کے مختلف دانشوروں نے بہت مختلف اسکیموں کے تحت ان کی درجہ بندی کی تھی۔ الفارابی کی ”احیاء العلوم“ کے مطابق علم قوانین، علم الکلام اور طبیعیات اسی طرح سائنس کے شعبے ہیں جس طرح کہ اقلیدس اور علم المناظر ہیں۔ اسی طرح شمس المولوی نے سائنس کو دو قسموں میں تقسیم کیا۔ علوم الاوائل (اخلاقیات، منطق، موسیقی، فلسفہ، ریاضی، فلکیات وغیرہ) اور علوم الاواخر (ادب، تصوف، تاریخ وغیرہ۔) الغزالی نے بھی معلومات یا علم کی اقسام کا تعین کیا تھا۔ سائنس کی یہ نوع بندی آج کی درجہ بندی سے مختلف ہے۔

بحث جاری رکھنے کے لئے ہم سائنس کے وہی معنی سمجھنے پر اکتفا کئے لیتے ہیں جو موجودہ زمانے میں سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ با معنی سوال کر سکتے ہیں کہ آیا ریاضی، علم المناظر، میکانیات، فلکیات، کیمیا اور طب میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے اسے ”اسلامی سائنس“ یا ”مسلم سائنس“ کو آگے بڑھانے یا ترقی دینے کے مترادف سمجھا جاسکتا ہے؟ ریاضی کو لے لیجئے۔ جس قسم کے مسائل ریاضی کو مسلمان سائنس دانوں نے قابل توجہ سمجھا، وہ ان مسائل سے چنداں مختلف نہ تھے جن کو ان سے پہلے مصری، بابلی، ہندو اور یونانی ریاضی دانوں نے حل کرنے کی کوشش کی تھی یا جو ان سائنس دانوں کی تحقیق کا موضوع رہے جو صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ یہ بات ان کامیابیوں کی نوعیت سے ظاہر ہوتی ہے جو ریاضی کے شعبے میں حاصل ہوئیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے جدید اعشاری نظام ایجاد کرنے میں ہندوستانی ہندسوں کے علم کو استعمال کیا۔ جمشید الکاشانی نے ثانیاتی قضیہ حل کر کے اس کام کا آغاز کیا، جو نیوٹن نے سات سو سال بعد مکمل کیا، ابوالوفا نے علم مثلث میں اہم کلیات قائم کئے۔ الخوارزمی نے الجبرا میں مساواتوں کے مطالعے کو منضبط کیا۔ عم خیام نے ملکی مساواتوں کا ہندی حل معلوم کیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ریاضی سے محبت کا براہ راست تعلق

”توحید“ سے ہے، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسری تہذیبوں میں بھی مماثل ریاضی کا ارتقا ہوا۔ فیثا غورث اور ڈیاؤفینٹائن خدائے واحد پر یقین نہیں رکھتے تھے، اس لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا جائز ہے کہ مسلمانوں کی ریاضی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے اس کو ”اسلامی ریاضی“ کا نام دیا جائے۔ اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہ کہ اپنے پانچ سو سالہ سنہری دور میں مسلم تہذیب نے دوسروں کے مقابلے میں بہتر کام کیا۔

یہی بات علم المناظر کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ شیشوں یا انعطاف نور پر ابن الہشیم کا کام ان مسائل سے متعلق تھا جن پر سائنس دان اس سے پہلے اور بعد میں کام کرتے رہے۔ اس کا مقام تاریخ میں اس لئے مسلمہ ہے کہ اس نے سب سے پہلے بعض مناظری کلیات دریافت کئے۔ ایسے سائنس دانوں کو پیدا کرنے کا فخر تمام تر اسلامی تہذیب کو حاصل ہے لیکن کسی مذہبی نظریے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بات موجودہ دور میں بھی بعض کٹر مذہبی حلقے پسند نہیں کرتے۔ مثلاً لندن سے سعودی امداد سے شائع ہونے والے ایک رسالہ نے کھل کر یہ الزام تراشی کی کہ ابن الہشیم اور اس کی مانند دیگر مسلمان عقلیت پسندوں نے جو کچھ کیا، وہ ”یونانی نظریات کا قدرتی اور منطقی نتیجہ تھا“۔ اس لئے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ وہ (ابن الہشیم) عموماً مذہب سے منحرف کافر سمجھا جاتا تھا اور مسلم دنیا اس کو تقریباً کلی طور پر فراموش کر چکی ہے۔

یہ خیال احمقانہ ہے کہ ایک مسلمان سائنس دان کے نظریات لازمی طور پر اس کے مذہبی عقیدے پر مبنی ہوں گے یا وہ اپنے سائنسی کام کا ذوق و شوق لازمی طور پر اپنے مذہب سے حاصل کرتا ہوگا۔ یہ بات جتنی کہ آج صحیح ہے، اتنی ہی آج سے ایک ہزار سال پہلے بھی تھی۔ الکیمیا اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ کیمیا بعض ارسطوی روایات پر مبنی تھی جو اریاس اور فیثا غورث سے بھی منسوب ہیں۔ اس کو جابر ابن حیان اور الرازی نے بہت زیادہ ترقی دی اور آج ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے کیمیا کی سائنس کے ارتقا میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ گو کہ آج ہر شخص جانتا ہے کہ الکیمیا (کیمیاوی طریقوں سے سونا بنانا) ایک احمقانہ کوشش تھی، کیونکہ سنگ فلسفی یا پارس پتھر جیسی کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے اور نہ ہی تانبے یا مین جیسی گھٹیا دھاتیں کیمیاوی طریقے سے سونا بن سکتی ہے۔ الکیمیا جس کو علم کیمیا کا آغاز سمجھتے ہیں،

سونا بنانے میں ناکامی کے باوجود ایک نہایت اہم چیز ثابت ہوئی کیونکہ کیمیا گروں نے اشیاء کو ٹھیک ٹھیک اور متناسب مقدار میں اجزاء کو ایک دوسرے سے ملانا سیکھا، تیزابوں اور الکلیوں کی خصوصیات کا علم حاصل کیا، بعض عناصر کی دیگر عناصر سے ہم آہنگی یا قربت کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں، لیکن یہ ایک ایسے پروگرام کے ضمنی اکتسابات تھے جو بنیادی طور پر ایک لاحقہ حاصل منزل کے لئے تھا۔ یقیناً یہ کہنا غلط ہوگا کہ مسلم الہیمیاء یا کیمیا گری کا شوق اسلام نے پیدا کیا تھا۔

کیا مسلمانوں کے سنہری دور کی سائنس عرب سائنس تھی؟

انیسویں صدی کے فرانسیسی ماہر اسلامیات ارنسٹ رینان اور جدیدیت نیز عملیت پسند مسلمان رہنما جمال الدین افغانی کے درمیان مشہور مباحثہ کے دوران رینان نے کہا تھا کہ ”اسلامی دنیا میں غیر عرب دانشوروں نے نہ صرف سائنس اور فلسفے کو روشناس کرایا تھا بلکہ ان کی آبیاری اور ترقی کے ذمہ دار بھی غیر عرب ہی تھے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ صرف ایک مسلم فلسفی الکندی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ رینان نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ ”عرب سائنس“ کی اصطلاح حقیقت پر مبنی نہیں ہے اس لئے یونانیوں اور ایرانیوں کو فلسفہ و سائنس کا پیش روا اور موجد سمجھنا زیادہ صحیح ہوگا۔

اسی طرح کے دلائل دوسروں نے بھی دیئے تھے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اگر ہم کچھ تفصیل کے ساتھ یہ معلومات فراہم کریں کہ اسلام میں سائنسوں کو کس طرح روشناس کرایا گیا اور بعد میں ان کا ارتقا کیسے ہوا۔ ہم ان دلائل کا مطالعہ بھی کریں گے جو افغانی نے رینان کو اپنے جواب میں لکھے تھے۔ اس مباحثے میں منطقی باتا عدگی پیدا کرنے کے لئے مناسب ہوگا اگر ہم ازمندہ وسطیٰ کی اسلامی تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کر لیں:

1- 700 عیسوی سے پیشتر کا ابتدائی دور۔

2- 700 عیسوی سے 1000 تک کلاسیکی عباسی خلفاء کا عہد۔

3- 1000 عیسوی سے 1250 عیسوی تک ازمندہ وسطیٰ کا عروجی دور۔

4- 1250 عیسوی سے 1500 عیسوی تک ازمندہ وسطیٰ کا آخری دور۔

ابتدائی دور میں فلسفہ یا سائنس کا وجود نہیں تھا۔ ان سے اسلامی دنیا کلاسیکی عباسی دور میں

روشناس ہوئی۔ تاہم 704ء میں بنو امیہ کے شہزادے خالد بن بزید نے خلافت حاصل کرنے میں ناکام ہونے کے بعد کیمیاگری کا مطالعہ شروع کیا اور اس کی تحریک پر کیمیاگری، جوش یا علم نجوم اور طب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ یہ وہ دور تھا جبکہ اسلامی علاقائی اور تجارتی اعتبار سے تیزی کے ساتھ وسعت پذیر تھا اور اسلامی معاشرہ متحرک تھا۔ تجارت و فتوحات کے باعث فارغ البالی اور خوش حالی نے ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو فکر معاش سے آزاد رہ کر دماغی و ذہنی کاموں کی طرف توجہ دے سکتا تھا۔ اس زمانے میں فنون لطیفہ اور سائنس کی ترقی ہوئی۔

پہلے قدم کے طور پر یونانی سائنس، فلسفے اور طب کی کتابوں کے ترجمے کا عظیم کام سرانجام دیا گیا۔ اس کام کا آغاز چند شاہپور میں ہوا، پھر اس کا مرکز بغداد بن گیا، جہاں پر کام کرنے والے زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ پروفیسر ساہرا کے مطابق ترجمہ کا کام کرنے والے زیادہ تر نصرانی عیسائی تھے۔ وہ مشرق قریب اور وسط ایشیا کے عیسائی مدارس اور خانقاہوں کے تعلیم یافتہ تھے۔ سب سے بڑا مترجم حسنین ابن اسحاق تھا، جس نے بشمول اپنے پسر اسحاق کے لوگوں کو مترجموں کو کام سکھایا تھا۔ ان لوگوں نے یونانی طب، فلسفے اور ریاضی کی متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ایک ماہر ترجمہ ثابت ابن قرہ تھا، جو حران کے صابیہ قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ ایک ایسے کافر مذہب کو مانتا تھا، جس پر جوش اور فیثا غورثی سریت کا گہرا اثر تھا۔ دوسرے بڑے مترجم ابولشتر مطعی اور یحییٰ بن عدی، دو یقیناً راہب تھے۔ یونانی تراجم سے پہلے بارامیکا جس کا شجرہ نسب بدھ مت سے جا ملتا تھا، نے بغداد میں بیت الحکمہ قائم کیا اور جس نے وہاں ہندو طب، ریاضی اور فلکیات کے مضامین کی تعلیم و تدریس شروع کی۔

اسلامی سائنسی ارتقا کا یہ پہلا دور دراصل یونان سے درآ مد شدہ علوم کو سمجھنے اور ہضم کرنے کا عہد تھا۔ اس دور میں مسلمان دانشوروں نے مترجموں کے طور پر ثانوی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اس ابتدائی دور میں مسلمان دانشوروں کا سائنس کی ترقی میں حصہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اگر صرف ابتدائی دور کو نظر میں رکھا جائے تو رینان کی دلیل صحیح ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی ماننا چاہیے کہ مسلمان حکمران طبقوں کی مکمل حوصلہ افزائی اور حمایت کے بغیر تراجم کا کام بھی ناممکن ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خلفاء کے درباروں اور شرفاء کے محلوں میں ہر مذہب و ملت کے دانشوروں اور ہنرمندوں کی پذیرائی اور عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ان کے ساتھ محض

ہاران، اندلس اور ایران سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں ماورائے آمو دریا اور شام کے پادری بھی شامل تھے۔ میں ایرانی دانشوروں کی عظیم خوبیوں کا منکر نہیں ہوں، نہ اس کردار سے چشم پوشی کرنا چاہتا ہوں جو دنیائے عرب میں ان سے منسوب ہے، لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ہارانی عرب تھے اور ہسپانیہ و اندلس پر قابض ہو کر حکومت کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ عرب اپنی قومیت سے محروم ہو گئے تھے، وہ عرب ہی رہے۔ اسلام سے کئی صدیوں پہلے سے ہارانیوں کی زبان عربی تھی۔ یہ حقیقت کہ وہ اپنے پرانے سبائی مذہب پر قائم رہے، اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ انہیں عرب قومیت سے علیحدہ سمجھا جائے۔ شامی پادری بھی زیادہ تر غسانی عرب تھے، جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔“

”جہاں تک ابن ماجہ، ابن رشد اور ابن طفیل کا تعلق ہے، تو کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ الکندی کی طرح محض اس وجہ سے عرب نہیں ہیں کہ ان کی پیدائش عرب میں نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور اگر تمام یورپی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو جائز طور پر یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ تمام ہارانی اور شامی بھی عظیم عرب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔“

رینان کا جواب الجواب (جو اسی رسالے میں دوسرے دن شائع ہوا اور جسے کیڈی نے افغانی پر اپنی کتاب میں نقل کیا ہے) افغانی کے جواب میں زیادہ تر دلائل کے جائز ہونے کو تسلیم کرتا ہے۔ افغانی کے دلائل متوازن اور معقول ہیں۔ غیر عرب اور غیر مسلموں کے اہم سائنسی کاموں کی حقیقت سے منکر ہوئے بغیر وہ موثر طریقے سے رینان کی باتوں کو رد کرتا ہے اور مباحثہ کے اس شعبے میں بازی جیت لیتا ہے۔ لیکن ایک مختلف مسئلہ یعنی خیالات کی آزادی اور سائنس کی ترقی کو روکنے میں مذاہب کے کردار پر بحث میں ہم افغانی اور رینان کے درمیان حیرت انگیز ہم آہنگی پاتے ہیں۔

کیا ازمہ وسطیٰ کے مسلم معاشرے نے سائنس کو قبول کر لیا تھا؟

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ازمہ وسطیٰ میں مسلم معاشرے کے اداروں نے کس حد تک عقلی سائنسوں کو قبول اور اپنے اندر جذب کر کے دوسروں کو منتقل کیا تھا۔ یہ معلوم کر کے ہم اندازہ لگا سکیں گے کہ سائنس کس حد تک مسلم معاشرے کا حصہ بن گئی تھی۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ ازمہ وسطیٰ کے عیسائی معاشرے

کے بشمول تمام روایتی معاشروں میں سائنس کا کردار موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھا۔ زمانہ حال میں ہم اس سائنس کے عادی ہو گئے ہیں جس کو کل وقتی سائنس دانوں اور کارکنوں کی ایک بڑی جماعت چلاتی ہے اور جس کے تحت بہت ہی مخصوص مہارت کے کام کئے جاتے ہیں اور جس کی اصطلاحات اور زبان غیر متعلقہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جدید معاشرے کے بڑے سائنسی اداروں کو سائنس دانوں کی یہ جماعت تخلیق کرتی ہے اور اپنی باری پر یہ ادارے سائنس دانوں کو پیدا کرتے ہیں۔ بڑی تکنیکی ایجادات کے باعث معاشی، سماجی، تعلیمی اور سیاسی ادارے پیدا اور ارتقا پذیر ہوتے ہیں۔ جدید تہذیب زیادہ تر سائنس کی ہی دین ہے۔ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ایسا نہیں تھا۔ بشمول اسلامی تہذیب، تمام تہذیبوں میں سائنس اور اس کے طریق کار کی وجوہ موجودہ زمانے سے مختلف تھیں۔ ایک مشترک بنیادی وجہ یقیناً موجود ہے اور وہ ہے ”انسانی تجسس“۔ زمانہ ماقبل تاریخ سے اعداد کی عجیب خصوصیات، کسوف و خسوف، مدوجزز کائنات کی وسعت، انسانی جسم کی پیچیدگی۔۔۔۔۔ غرضیکہ قدرت کے ان سب مظاہر نے انسان کے تجسس کو ہوا دی ہے۔ سائنس کی تہہ میں جانے کی خواہش اور غیر مرئی حالات کو پیدا اور مربوط کرنے کی دماغی صلاحیت کا فرما ہے۔ انسان کی یہ طاقت ہر زمانے میں کارفرما رہی ہے اور ہر معاشرے نے اس کو ترقی دی ہے اس لئے یہ کہنا یقیناً صحیح ہے کہ انسانی وجود اور سائنس لازم و ملزوم ہیں۔

تاہم، روایتی تہذیبوں، بشمول اسلامی تہذیب کے عہد میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے درمیان باہمی وابستگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ قدیم سائنس کے باعث زراعت، تعمیر، پارچہ بانی اور اسلحہ میں کوئی قابل ذکر ترقی نہیں ہوئی۔ اس زمانے کی ٹیکنالوجی بنیادی طور پر تجربی اور عارضی ہوتی تھی۔ اس کی تہہ میں کوئی سائنسی اصول نہیں ہوتا تھا۔ زیادہ تر سائنس کتابوں کے مطالعے اور مباحثوں سے متعلق ہوتی تھی اور عملی افادیت کے معیار سے سابقہ بہت کم پڑتا تھا۔ اس کا مطلب اور باتوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ اس تہذیب کی حدود میں، جس نے کہ اس سائنس کو پروان چڑھایا تھا، مسلم سائنس کے تمام امکانات کا حصول ممکن نہیں تھا۔ الجوارزمی نے الجبر و المقابله۔ (الجبرا) جس طرح باقاعدہ بنایا، وہ یقیناً ایک حسین کارنامہ تھا اور اسے غیر مرئی تخیل کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن علم و دانش کی ترقی کے اس ابتدائی

مرحلے پر یہ امر واضح نہیں تھا کہ عملی زندگی میں سائنس اور ریاضی کا کیا استعمال ہو سکتا ہے۔ یورپ میں جدید تہذیب کی پیدائش سے پہلے ریاضی کا ٹیکنالوجی سے ضروری تعلق قائم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی جدید ٹیکنالوجی کا انحصار زیادہ تر تجرباتی ذہن پر تھا۔ سائنس کے عملی پہلو کی حیثیت سے ٹیکنالوجی انیسویں صدی عیسوی سے پہلے وجود میں نہیں آئی تھی۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں زیادہ تر ایجادیں اور تجرباتی دریافتیں سائنس کی نظریاتی بنیادوں کے بغیر وجود میں آئی تھیں۔ مثال کے طور پر دھاتی انجن پہلے ایجاد ہوا اور قوت حرارت کا عملی نظریہ بعد میں پیش کیا گیا۔

اس لئے جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں کہا ہے، ازمنہ وسطیٰ کے اسلامی معاشرے کے مسائل اور ضروریات سے سائنس اور ریاضی کا براہ راست تعلق نہیں تھا، تاہم مستثنیات موجود تھیں۔ لیکن وہ چند اہم نہ تھیں۔ یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جاسکتی ہے کہ تجارت، زمین کی پیمائش اور نقشہ کشی کے شعبوں میں عملی مسائل درپیش ہونے کی وجہ سے مدرسوں کے نصاب میں بنیادی ریاضی شامل کی گئی تھی۔ ریاضی کا ایک اور استعمال کرہ ارض کے مختلف مقامات پر قبلے کی سمت کا تعین کرنے کے لئے کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ریاضی کی مدد سے نماز کے اوقات کا جدول تیار کیا جاتا تھا۔ اس کام میں مسجد کا منوقت کبھی کبھی علم مثلث اور الجبرا سے بھی کام لیتا تھا۔ انجینئرنگ اور تعمیرات میں بھی ریاضی سے کام لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر فاطمی خلیفہ اکھیم نے ابن الہشیم کو دریائے نیل کے بہاؤ کی تسخیر کے کام پر مامور کیا تھا۔ بد قسمتی سے اسے اس کام میں ناکامی ہوئی کیونکہ اس زمانے میں مٹی کھودنے اور منتقل کرنے کی ٹیکنالوجی نے ترقی نہیں کی تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کے اسلامی معاشرے میں ٹیکنالوجی کو سائنس کی ترقی کا بڑا سبب قرار نہ دیا جائے تو یہ بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اسلام میں سائنس کی ترقی کے کیا اسباب تھے؟ ایک بنیادی عنصر سائنس اور علوم میں روشن خیال خلفاء اور شہزادوں کی دلچسپی معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے دانشوروں کی سرپرستی کی۔ اس سرپرستی کے مقابلہ میں روشن خیالی کے عہد میں فرانسیسی اشرافیہ کی سرپرستی بھی بیچ ہے۔ دانشوروں کو اپنے درباروں میں بلانے کے لئے حکمران ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ خلیفہ مامون کے

دربار میں الکندی، سلطان محمد ابن تكلوش کے دربار میں فخر الدین رازی، مختلف سلطانون کے طبیب کی حیثیت سے ابن سینا، حکیم کے مشیر کی حیثیت سے ابن اہشیم، المنصور کے تحت ابن رشد۔۔۔۔۔ غرضیکہ تمام عظیم دانشور ازمنہ و سطلی میں شاہی درباروں سے وابستہ تھے۔ جس سے ان کو پیشہ وارانہ شہرت، معاشرتی احترام، کتب خانوں اور تجربہ گاہوں سے استفادہ اور (شاید سب سے اہم بات) فیاضانہ وظائف ملتے تھے۔ خلیفہ کی سرپرستی دانشوروں کو ایسے کڑ مذہبی ملاؤں سے محفوظ رکھتی تھی جو سائنسی اور علمی دریافتوں کو کفر کے مترادف سمجھتے تھے۔ اس تحفظ کے بغیر اسلام میں علم و دانش کا سنہری دور نہ آتا۔ لیکن شاہی سرپرستی پر انحصار مسلم سائنس کی ایک خطرناک ساختیاتی کمزوری کا مظہر بھی تھا۔

اس کا انحصار کہ کس قسم کے علوم کو ترقی ملے گی اور انفرادی طور پر دانشوروں کا مقدر کیا ہوگا، اس پر ہوتا تھا کہ سرپرست کی طبیعت کے رجحانات کیا ہیں۔ حکمران خاندان کے موجودہ حالات کیا ہیں اور دربار میں کیا سازشیں ہو رہی ہیں۔ حکمران کی تبدیلی کا مطلب اکثر یہ ہوتا تھا کہ پرانے دربار کے درباریوں اور دانشوروں پر مصیبت آنے والی ہے۔ مثلاً الکندی کی قبیل کے معقولیت پسند دانشوروں نے المامون کے بعد المتوکل جیسے قدامت پرست خلیفہ کے تحت نشین ہونے پر فرار ہو کر جان بچائی۔ اس کے زمانے میں تمام جامعات بند کر دیئے گئے۔ ادب، سائنس اور فلسفہ کو کفر قرار دیا گیا اور معقولیت پسندوں کو بغداد سے کھدیڑ دیا گیا۔ لیکن کسی دانشور کے فرار کا سبب ہمیشہ ہی نظریاتی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ ابن سینا کی سوانح حیات سے پتہ چلتا ہے کہ طبیب کی زندگی اکثر ایک نازک دھاگے سے لٹکی ہوئی ہوتی تھی، خصوصاً اس وقت جبکہ شاہی خاندان کا کوئی شخص ناقابل علاج مرض میں مبتلا ہو جائے۔ کبھی آدھی رات کے وقت گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہونا، کبھی درویش کا روپ دھار کر چپ چاپ نکل جانا۔۔۔۔۔ اس طرح ابن سینا کا ایک دربار سے دوسرے دربار کو جانا، ایک طرح سے بھرپور ناول کا باب معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس کے کچھ ہم عصر اتنے خوش قسمت نہیں تھے اور وہ اس دنیا سے طبعی زندگی ختم ہونے سے پہلے رخصت ہونے پر مجبور کئے گئے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف سائنس، بلکہ تمام دنیاوی علوم مسلم معاشرے کے اونچے طبقے کے روشن خیال دانشوروں تک محدود نہایت مخفی یا پراسرار مضامین سمجھے جاتے تھے۔ یہ نتیجہ مندرجہ

باب نو

مذہبی کٹرپن اور مسلم سائنس

علم تاریخ سائنس نہیں ہے۔ طبیعیات میں ابتدائی حقائق مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کرتے ہیں یا ان کا تعین کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس، تاریخ کا علم ہمیں اس قابل نہیں بناتا کہ ہم یقین کے ساتھ پیش گوئی کر سکیں۔ تاریخ میں تعلیل یعنی یہ یقین کہ مخصوص واقعات مخصوص علل یا اسباب کا نتیجہ تھے، غلطی کے خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس میں یہ مفروضہ مضمر ہے کہ ایک سبب ہمیشہ ایک ہی اثر یا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اس کے برخلاف کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ تاریخی اسباب یا تشریحات کا مطالعہ بے سود ہے کیونکہ تاریخ کوئی سبق نہیں سکھاتی۔ اس نظریے کی قبولیت کا منطقی مطلب یہ ہے کہ ہم نوع انسان کے تمام تجربات کو رد کر دیں، اس کے علاوہ ہر حادثے یا واقعے کو خواہ وہ اہم ہو یا غیر اہم، مقدس نبی منسوبے کا حصہ سمجھنا چاہیے یا پھر اسے محض حادثاتی سمجھ کر رد کر دینا چاہیے۔ اس طرح نہ صرف ماضی بلکہ زندہ حال بھی بے ربط اور ناقابل فہم ہو جاتا ہے۔

اسلامی تہذیب کی تاریخ میں سائنس کے زوال اور بالآخر اس کی مکمل تباہی پر غور (جو بالخصوص

موجودہ اسلامی دنیا میں سائنس کی حالت زار کے پس منظر میں ہوگا) کے نتیجہ میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ سائنس کا یہ مخصوص تاریخی دور تجزیہ سے بالا ہے یا وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ سائنسی دور خدائی ارادے کا محض ایک اظہار تھا، ایسی صورت میں مزید بحث بے سود ہوگی۔ اس کے برعکس یہ رویہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی دنیا میں سائنس کے زوال کے اسباب معلوم کئے جائیں۔ مختلف جوابات پر اتفاق رائے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ جواب کی تلاش میں مختلف تاریخ داں حقائق کے ایک ہی تھیلے میں ہاتھ ڈالیں گے اور ہر مورخ دوسروں سے مختلف جواب دے گا۔ مورخین کا ایک گروہ خارجی اسباب پر توجہ مرکوز کرے گا، مثلاً منگولوں کا حملہ بغداد کی تباہی، صلیبی جنگیں وغیرہ۔ اور مجموعی طور پر فوجی شکست کو سائنس کے زوال کا خاص سبب قرار دے گا لیکن راسخ الاعتقاد مورخ اسلامی اقدار کے فقدان کو خاص سبب بتائے گا۔ میری رائے میں کسی ایک سبب کو زوال کا سبب قرار دینے کے بجائے ہمیں وہ اسباب تلاش کرنے چاہئیں جن کی گواہی تاریخ سے ملتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کا زوال بے روح اور منجمد مذہبیت کے عروج سے وابستہ ہے۔ اس مذہبیت کے باعث دنیاوی پیشوں میں ترقی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئی۔ سائنس کے خلاف کٹرپن کا رد عمل ہی اس کے زوال کا واحد سبب نہیں تھا، اقتصادی اور سیاسی اسباب بھی تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ جیسے جیسے عدم رواداری اور کٹرپن کا شور بڑھتا گیا، دنیاوی سائنس زوال پذیر ہوتی چلی گئی اور آخر کار جب چودھویں صدی میں اسلامی دانش کا سنہری دور اختتام کو پہنچا تو سائنس کی شاندار عمارت خاکستر ہو چکی تھی۔ اس کے بعد مسلم ثقافت ایک شاندار ماضی کی سخت جان یادگار بن کر رہ گئی۔

سائنس کے خلاف کٹر مذہبیت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں تیرہ سو سال پہلے اسلام کی پہلی صدی میں واپس جانا ہوگا۔ اس وقت اسلام کے نئے مذہب نے عربوں کو ایک شناخت، شعور اور دنیا کو دیکھنے کا ایک ایسا زاویہ نگاہ دیا جو قبیلے اور نسل کی تنگ حدود سے وسیع اور بالا تھا۔ اسلام کے ثقافتی انقلاب نے ان کو قدیم تہذیبوں کی دانش کے جگمگ کرتے خزانوں کا وارث بنا دیا۔ یونانی فلسفہ و سائنس، ایرانی ادب، ہندوستانی طب اور ریاضی اور مصری و بابلی سائنس کے بعض پہلو جن سے یونانی بھی ناواقف تھے۔ اسلام سے پہلے کی یہ سائنسیں، جن کو علوم الاوائل کہا جاتا تھا، اس زمانے کی تمام معلومات اور فنون پر حاوی تھیں۔ مثلاً طب، فلکیات، فلسفہ

ریاضی، قدرتی سائنس، موسیقی اور پراسرار علوم۔ سچ تو یہ ہے کہ علوم الاوائل دانش کے خزانوں کا بڑا ذخیرہ تھے۔ دنیاوی علم کے ان عناصر کو اسلامی ایمان میں جذب کرنا ایک چیلنج تھا اور اس دور کے مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کر لیا تھا۔

ابتدائی دور کے مسلمان دانشور یونان کے قیاس منطقی پر مہارت سے سرشار ہو کر اسے مذہبی بحثوں میں استعمال کرنے لگے۔ اس کا پہلا قابل ذکر استعمال انسانی اختیار پر یقین رکھنے والوں اور تقدیر کے جبر کو ماننے والوں کے درمیان ہوا۔ ایک طرف ”قدری“ تھے جو ایک خالص مذہبی تفسیر پر ایمان رکھتے تھے وہ انسان کے اختیار یا اس کی قدرت کو ثابت کرنے کے لئے ارسطو کی قیاسی منطق استعمال کرتے تھے۔ قرآنی آیات کے حوالے سے ان کا استدلال یہ تھا کہ انسان کے سامنے کئی راستے ہوتے ہیں، جن میں سے وہ اپنی پسند کا رستہ منتخب کر سکتا ہے۔ یہ دلیل محض مذہبی یا نظریاتی نہ تھی یہ سیاسی بھی تھی۔ یہ یقین کہ انسان کو آزاد ارادہ اور فیصلے کی طاقت ودیعت کی گئی ہے اس مفہوم کا ہی حامل تھا کہ خلفائے بنو امیہ کی حکومت کو مشیت ایزدی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس لئے یہ ایک واضح انقلابی نظریہ تھا اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں اسلام سیاسی تبدیلی کا ذریعہ اور ظلم و نا انصافی کے خلاف لوگوں کو متحرک کرنے والا نعرہ تھا۔ اس تنازعہ میں فریق مخالف تین فرقے تھے۔ حتمیہ، نجاریہ اور ضراریہ۔ ان تینوں کو مجموعی طور پر جبریہ کہا جاتا تھا۔ جبری سخت تقدیر پرست تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر واقعہ اور عمل خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک کربلا میں حضرت امام حسین کی شہادت بھی عمل تقدیر یا مشیت ایزدی کا مظہر تھی، اس لئے ان کے قاتلوں کی مذمت کرنا یا ان کے قتل کا ماتم کرنا بے فائدہ ہے۔

”آزاد ارادے“ کے باغیانہ نظریے کی وجہ سے اموی حکمرانوں کے مفاد پر ضرب پڑتی تھی، اس لئے قدریوں پر ان کا عتاب نازل ہوا۔ مروان ابن عبدالملک کے دور حکومت میں قدریوں کے لیڈر عابد الجبہانی کا سر قلم کیا گیا۔ ایک عرصہ تک قدریوں کو اذیتیں دی گئیں اور انہیں صلیبوں پر چڑھایا جاتا رہا لیکن ان کا نظریہ نہ ختم ہو سکا۔ بلکہ اس نظریے نے معتزلہ تحریک کو جنم دیا جس پر ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔

کٹر پن کے خلاف معتزلہ کی بغاوت:

بصرہ اور بغداد کی سڑکوں پر آزاد ارادے کے ماننے والوں اور جبر تقدیر پر یقین رکھنے والوں کے درمیان خونریز فسادات نے آخر کار عقل پرست فلسفیوں کے ایک انتہا پسند مکتب خیال کو جنم دیا جو معتزلہ (مخالفین) کے نام سے مشہور ہوا۔ معتزلہ کے فلسفہ کی گونج مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر اور مسلم معاشرے میں صدیوں تک گونجتی رہی۔ خلیفہ مامون الرشید اور خلیفہ معتصم باللہ نے معتزلہ فلسفہ کو نظریہ مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا اور دس صدیوں سے زیادہ کے عرصہ تک (جس میں یورپی نوآبادیاتی تسلط کا دور بھی شامل ہے) معتزلہ نظریات مسلمان مصلحین کے خیالات کو متاثر کرتے رہے۔ آج بھی ان کے نظریات مسلمانوں کی جدید فکر میں پائے جاتے ہیں۔

آٹھویں صدی کے اوائل میں امام حسن البصری کے سابق شاگرد واصل ابن عطاء نے معتزلہ مکتب خیال کی بنیاد رکھی تھی۔ عام عقائد سے اختلاف کے باعث ابن عطاء کو امام حسن البصری کے مدرسہ سے علیحدہ ہونا پڑا۔ بعد میں اس نے اپنا الگ مدرسہ قائم کیا۔ معتزلہ ایک علیحدہ فرقہ نہیں تھا اور اس میں سنی و شیعہ فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ البتہ بعد میں معتزلہ میں بھی ایک علیحدہ فرقے کی خصوصیات پیدا ہو گئی تھیں؛ جبریہ فرقہ کے کٹر پین کے رد عمل میں معتزلہ نے مذہب کے عقائد اور عقلیت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی عقائد اور یونانی منطق کے امتزاج سے جو مذہبی سائنس وجود میں آئی، اسے علم الکلام کا نام دیا گیا۔ علم الکلام ہی مسلم علوم کی بنیاد قرار پایا اور صدیوں تک اسلامی فکر اس سے متاثر رہی۔ علم الکلام پر مبنی مذہبیت اسلامی عقائد کو منطقی دلائل سے ثابت کرنے اور مادہ پرستوں، نیز دین فانی کے ماننے والوں کے حملوں سے دفاع کے کام آتی رہی۔

اسلامی ایمان کو عقلی اور فلسفیانہ بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش میں معتزلہ نے اخلاقیات اور عقلیت پر مبنی دلائل سے کام لیا۔ گو وہ اپنے دعاوی کے ثبوت میں قدرتی طور پر قرآنی آیات پیش کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ایسے نتائج پر پہنچتے تھے جو راسخ العقیدہ ملاؤں کی نظر میں کفر یا شرک سے مترادف ہوتے تھے۔ معتزلہ عقائد کے بعض عناصر خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ تھے۔

☆ ارادے کی آزادی اور اختیار کا مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ معتزلہ کو اس اخلاقی مشکل کا

شدت سے احساس تھا جو کٹر ملاؤں کے اس دعوے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ خدا گناہ گاروں کو ڈھیل دیتا ہے ان کی سیہ کاری پر فیصلہ صادر کرتا ہے ہے اور پھر گناہوں کی پاداش میں انہیں جہنم کی آگ میں جھونک دیتا ہے۔ وہ پوچھتے تھے کہ وہ خدا جو رحمن اور رحیم ہے ایک ایسے شخص کو ان کاموں کے لئے کیونکر سزا دے سکتا ہے جو اس نے خدا کے حکم سے ہی کئے تھے؟ معتزلہ کو یقین تھا کہ تقدیر کا جبر اللہ تعالیٰ کے مقدس اصول عدل کے منافی ہے اس لئے وہ خود کو ”مقدس اصول عدل“ کے علمبردار سمجھتے تھے۔ گناہ کی سزا اور نیکی کی جزا کے مسائل کا حل ان کے نزدیک یہ تھا کہ خدا کو مطلق العنان آمر کے بجائے محض ایک قانون ساز سمجھا جائے۔ وہ یہ دلیل دیتے تھے کہ سزا و جزا کے مقدس فیصلوں کو معقول اور با معنی بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھے اور برے میں تمیز کی صلاحیت عطا کی ہے اور اسے اچھے یا برے کو منتخب کرنے کا پورا اختیار دیا ہے۔ معتزلہ کے اس حل کو کٹر ملاؤں نے کفر و شرک قرار دیا۔ وہ کہتے تھے کہ انسان خالق (خدا) ہوئے بغیر اپنے اعمال کا خالق کیونکر ہو سکتا ہے۔

☆ معتزلہ کا نظریہ اس زمانے میں مقبول عام بشر سے مماثل خدا کے تصور کی نفی کرتا تھا۔ معتزلہ کہتے تھے کہ ”وہ (خدا) نہ جسم ہے نہ شے ہے نہ جسم ہے نہ بیت ہے نہ گوشت و پوست ہے نہ خون ہے نہ شخص ہے نہ مادہ ہے۔۔۔۔۔۔ وہ (خدا) حواس کی پہنچ سے باہر ہے۔ انسان کسی تمثیل سے اسے نہیں سمجھا سکتا۔ آنکھیں اسے نہیں دیکھتیں، بصرات اس تک نہیں پہنچتی۔“

یہ عقائد معتزلہ کے مخالفین کے عقائد کی بالکل ضد ہیں۔ معتزلہ کے خلاف تحریک کا سربراہ الحسن الاشعری تھا۔ وہ پہلے عقلیت پسند تھا، بعد میں خود اپنے ماضی اور اپنے مرشدین کے ”کفر و شرک“ کا شدید مخالف ہو گیا۔ الاشعری کی ظاہر پرستی اور خدا کا بشر سے مماثل تصور سنی اسلام کے عقائد کا حصہ قرار پائے۔ الاشعری نے لکھا:

”ہم مانتے ہیں کہ خدا اپنے تخت پر متمکن ہے۔۔۔۔۔۔ یہ پوچھے بغیر کہ کیونکر اور کس طرح ہم جانتے ہیں کہ خدا کے دو ہاتھ ہیں، دو آنکھیں ہیں۔۔۔۔۔۔ ہم مانتے ہیں کہ خدا کا چہرہ ہے۔۔۔۔۔۔ اور ہم تصدیق کرتے ہیں کہ وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔“

معتزلہ نے مندرجہ بالا صفات سے انکار کیا۔ انہیں اصرار تھا کہ خدا خالص جوہر ہے۔ چنانچہ اس پر الزام عائد کیا گیا کہ وہ خدا کی ذات کو اصلیت سے محروم کر کے انسان کے لئے اس کی

تفہیم اور پرستش کو مشکل بنا رہے ہیں۔

☆ معتزلہ احادیث (پیغمبر کی روایات اور اقوال) کو بے سود سمجھتے تھے، کیونکہ انہیں راویوں کی باتیں مشکوک معلوم ہوتی تھیں۔ وہ عقلی دلیل کو الہام و وحی کے برابر اہم سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے تفسیر کا ایک صرف و نحو پر مبنی طریقہ ایجاد کیا، جس کے ذریعہ وہ قرآن کے ایسے نکات کی تشریح کرتے تھے، جو بظاہر معقولیت کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تھے۔ بعض علماء کے نزدیک یہ طریقہ کافرانہ تھا، لیکن اس سے بھی بڑھ کر معتزلہ کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن ابدی نہیں بلکہ خدا کی تخلیق ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے انہوں نے کئی دلائل دیئے۔ مثلاً اگر قرآن تخلیق نہیں تو اسے خالق (یعنی خدا) ہونا چاہیے۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم وحدانیت سے منکر اور شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ایک اور دلیل یہ تھی کہ قرآن میں حضرت موسیٰ کے اقوال درج ہیں اور حضرت موسیٰ دنیوی یا زمانی مخلوق تھے، اس لئے قرآن کیونکر ابدی ہو سکتا ہے؟

ابتدائی دور میں منطقی قیاس کی طاقت کٹر ملاؤں کی فہم سے بالاتھی، اس لئے معتزلہ کو کسی سنجیدہ نظریاتی اختلاف کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔ معتزلہ کے نظریات دور خلافت میں اشرافیہ کے درباروں میں پھیل گئے۔ اندلس میں بھی اسے اختیار کیا گیا۔ خلیفہ منصور نے گواعلانیہ طور پر معتزلہ کا مسلک اختیار نہیں کیا، لیکن اس کی حوصلہ افزائی کی اور مامون و معتصم کے دور میں نظریہ ریاست کی حیثیت سے اس کو عملاً نافذ کیا گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی تاریخ میں مامون الرشید فلسفہ و سائنس کا سب سے بڑا سرپرست تھا۔ اس کے دور میں بیت الحکمہ کا قیام ایک سنگ میل تھا۔ اس ادارے کے کتب خانہ میں کتابیں جمع کرنے کے لئے مامون نے برنطین اور دیگر ملکوں میں اپنے سفیر بھیجے کہ وہ فلسفہ و سائنس کی کتابیں لائیں تاکہ ان کا ترجمہ کیا جائے۔

مساجد اور مدارس میں تعقل کے نظریہ کی تبلیغ کی گئی اور معقولیت تعلیم یافتہ ہونے کا نشان قرار پائی۔ اسے معاشرے کے دانشور طبقوں۔۔۔۔۔۔ شہزادوں، درباریوں، قاضیوں، پروفیسروں، معلموں، ڈاکٹروں اور تاجروں۔۔۔۔۔۔ نے ایک مسلک کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ معتزلہ حکمرانوں کے دور میں دنیاوی سائنسوں نے نہایت تیزی سے ترقی کی۔ زیادہ تر بڑے اسلامی

دانشوروں اور سائنس دانوں نے یا تو اعلانیہ تعقل پسندی کو قبول کیا یا وہ اس سے متاثر ہوئے۔
الکندی، الرازی، ابن سینا، ابن الہشیم، ابن رشد اور کئی دوسرے دانشور اور سائنس دان معتزلہ
نظریات رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ معتزلت اسلام کے دائرے میں ایک عظیم اسلامی تحریک تھی۔ یہ
تحریک نہ تو اسلام کے دائرے سے باہر تھی اور نہ ہی اسلام کے خلاف تھی۔ لیکن آخر کار اس
تحریک کو شکست دے کر اسے اسلامی عقائد کے دھارے سے الگ کر دیا گیا۔ کیوں؟ ممکن تھا
کہ معتزلہ کا گروہ جس میں شیعہ و سنی دونوں ہی شامل تھے، منظم عقلیت، دلائل اور براہین کے
ذریعہ اس جاری تفرقہ کو مٹانے میں کامیاب ہو جاتے جو خلفائے راشدہ کا عہد ختم ہونے کے
بعد ہی شروع ہو گیا تھا، اس کا بھی امکان تھا کہ معتزلہ نظریات مذہب کو عقلی بنیاد فراہم کرتے۔
لیکن جن اسباب نے مل کر ان نظریات کو مسترد اور آخر کار ختم کر دیا، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا سبب یہ تھا کہ اقتدار مملکت تک رسائی نے سمعتزلہ کو بد عنوان اور ظالم ہونے کا موقع فراہم
کیا۔ ایک ایسے نظام میں جس کے تحت خلافت پر سازشوں، چالبازیوں یا فوجی کامیابیوں کے
ذریعہ قبضہ کیا جاتا تھا اور جمہوری شرکت کا تصور وجود میں نہیں آیا تھا، ظلم اور زبردستی سے کام
لینا حکومتوں کا معمول تھا اور طاقت کا استعمال حکمرانوں کی مرضی کے مطابق کیا جاتا تھا۔ معتزلہ
حکمرانوں نے بھی طاقت کے استعمال میں مطلق العنانیت سے کام لیا۔ المامون نے ان تمام
قاضیوں، مفتیوں اور علماء پر ظلم کیا، جنہوں نے تخلیق قرآن کے نظریے کو ماننے سے انکار کیا۔
ایسے لوگوں کو ”عدالت استیصال الحد“ یا ”مذہبی احتساب کی عدالت“ کے سامنے پیش کیا جاتا
تھا، جن پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ وہ تخلیق قرآن کے معتقد نہیں ہیں۔

مذہبی بنیاد پر امام احمد ابن حنبل جیسے قدامت پرستوں نے معتزلہ کی مخالفت کی۔ وہ ان لوگوں
میں سے ایک تھے جنہیں مخالفت کرنے کے جرم میں اذیت دے کر ختم کیا گیا۔ وہ مذہبی احکام
کو جوں کا توں بجالانے پر پکا ایمان رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ”ہر اس موضوع پر مباحثہ جسے
پیغمبر زیر بحث نہ لائے ہوں، غلط ہے اور اس بات پر وہ آخر وقت تک قائم رہے۔ خلق قرآن
کے نظریے کو تسلیم نہ کرنے میں استقامت کے باعث قدامت پرست امام حنبل کی بڑی عزت
کرتے ہیں۔ لیکن ایسے مسلمان بھی ہیں جو امام حنبل کو ہیرو نہیں مانتے۔ مثال کے طور پر

انیسویں صدی کے روشن خیال دانشور سید امیر علی کا نقطہ نظر امام حنبلی کے متعلق مختلف ہے۔ وہ امام حنبلی اور ان کی طرح کے دیگر جوشیلے کٹر مسلمان دانشوروں کو اس بات کا مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ انہوں نے معتزلہ کی زیادتیوں کو سادہ لوح اور پسماندہ مسلمانوں کو تعقل کے خلاف بھڑکانے کے لئے استعمال کیا۔

”اس موقع پر احمد بن حنبلی سامنے آئے۔ وہ امام حنبلی کے نام سے مشہور تھے۔ دین کی پابندی میں سخت احتیاط کے قائل تھے اور ہر اس شخص کو ابدی عذاب کی بددعا دیتے تھے جو ان کے نظریات سے اختلاف کرتا تھا۔۔۔۔۔۔ انہوں نے علوم اور سائنس کی مذمت کی اور تعقل کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ عوام الناس نے ان کے جوشِ خطابت سے متاثر ہو کر اس اعلان پر لبیک کہا۔۔۔۔۔۔ منبروں سے تعقل، فلسفہ اور سائنس کے علمبرداروں اور حامیوں کے خلاف آگ اگلی جانے لگی۔ بغداد کی سڑکوں اور گلیوں میں فساد ہونے لگے، خون بہنے لگا۔ عقل پرستوں کی ناکامی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے مخالفین کو عوام الناس میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ راویوں کا کہنا ہے کہ احمد بن حنبلی کے جنازے پر ڈیڑھ لاکھ لوگوں کا مجمع تھا، جو اس وقت کے اعتبار سے ایک بڑی تعداد تھی۔“

معتزلہ کے تعقل کی ناکامی کا دوسرا سبب اور غالباً زیادہ بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ استدلال کو الہام یا وحی پر فوقیت دیتے تھے، گو کہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ ان دونوں کے درمیان تضاد نہیں ہے۔ اس وجہ سے اکثر ناقابل برداشت مناظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ پر بات بہت واضح ہو کر سامنے آئی۔ یہ نظریہ مذہبی عقیدے کے لئے ایک بنیادی خطرہ تھا۔ اے۔۔۔۔۔۔ آری کی رائے میں:

”قرآن کو خلق ہونے کی اجازت دینے سے ایک خطرہ یہ تھا کہ نوافل طوفانی نظریات کے ماننے والے دوسرا دعویٰ یہ کریں گے کہ خدا کا کلام جو فرشتے، جبرئیل کی وساطت سے حضرت محمد (صلعم) پر منکشف ہوا، ان خام تخلیق شدہ اشیاء کی طرح تمام ہو سکتا ہے کہ جن کا تعلق مادے سے ہے۔ اگر وحی کو اپنے ہی گڑھ میں تعقل کے زیر نگیں نہیں ہونے دینا ہے تو قرآن کے ”لا ثانی معزے“ کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہیے۔“

خلیفہ المتوکل (جس کے متعلق سید امیر علی کا یہ بیان ہے کہ وہ ”قاضیوں اور ملاؤں سے گٹھ جوڑ

کرنے والا بے رحم پکا شرابی تھا)۔ کے برسر اقتدار آنے پر معتزلہ اور شیعہ مسلمانوں کے خاتمہ کا کام نہایت سنجیدگی کے ساتھ شروع ہو گیا۔ انہیں حکومت کے تمام عہدوں سے ہٹا دیا گیا۔ کفر و شرک کے الزامات عائد کئے گئے؛ اذیتیں دی گئیں اور سائنس دان جو تعقل میں یقین رکھتے تھے بغداد سے فرار ہو کر اسلامی دنیا کے دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ اس طرح اسلام میں تعقل اور الہام کے ملاپ کی ایک سنجیدہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اس وقت سے اب تک انیسویں صدی کے مصلحین کی مختلف اور انفرادی کوششوں کو چھوڑ کر، اسلام میں دینی اور دنیاوی علوم کے درمیان علیحدگی قائم ہے۔

کٹر پن کا جوابی حملہ:

یونانی روایت کے عقلی اور دنیاوی رویے کے باعث اسلام کے ابتدائی دور میں سائنس اور علوم کی ترقی ہوئی۔ لیکن بعد میں مذہبی کٹر پن نے اس رویے کو چیلنج کیا۔ جلد ہی راسخ العقیدہ ملا علوم الاوائل کو کفر کے مترادف قرار دینے لگے اور فلسفہ کو مذہبی نقطہ نظر سے مشتبہ سمجھا جانے لگا۔ یہ رویہ عام نہیں تھا اور ابتدا میں اسلامی تہذیب میں دنیاوی سائنسوں کے ادغام میں اس کا چنداں زیادہ اثر نہیں پڑا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلم سائنس وجود میں ہی نہ آتی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ دنیاوی علوم کے خلاف رویہ سخت ہوتا گیا۔ بیسویں صدی تک الاشعری کے قدامت پرست اور خلاف تعقل مکتب فکر نے معتزلہ کے اثرات کو ختم کر دیا۔

1916ء میں ہنگری کے عالم اسلامیات اگناز گولڈ زیہر نے علوم الاوائل اور مذہبی راسخ الاعتقادی کے درمیان تعلق پر سب سے اہم اور مفصل کتاب لکھی۔ عربی کے اصل ذرائع سے جو اسلامی تاریخ کے ایک وسیع عہد پر محیط تھے، حوالے دے کر گولڈ زیہر نے راسخ العقیدگی اور فلسفیانہ سائنسوں کے درمیان اختلافات کی تاریخ کو قلمبند کیا ہے۔ اس کی کتاب کا ترجمہ جرمن زبان سے انگریزی میں حال ہی میں ہوا ہے۔ گولڈ زیہر کے مطابق باوجودیکہ علوم الاوائل میں بعض اسلامی مذہبی حلقوں اور عباسی خلفاء نے دلچسپی لی، کٹر راسخ الاعتقاد نے ہمیشہ ان لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا، جو شافعی اور مالک کی سائنسوں کو چھوڑ کر امبی ڈو کلیس کی آراء کو اسلامی قانون کا درجہ دینے پر مائل تھے۔ یہ شبہ تنگ نظر راسخ الاعتقاد علماء کے بڑھتے ہوئے اثر کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر گیا اور اس کا اظہار کئی طریقوں سے ہوا:

☆ کئی راسخ العقیدہ دانشوروں کی تحریروں میں علوم الاوائل کو صریحاً علوم المجرورہ (رد کئے ہوئے علوم) قرار دیا گیا ہے اور انہیں حکمتہ مشوبہ بالکفر (کفر آلودہ عقل) کہا گیا ہے۔ ہسپانوی ابراہیم ابن موسیٰ (تاریخ وفات 1398ء) اس نتیجہ پر پہنچا کہ راسخ العقیدہ علمائے مذہب صرف ان سائنسوں کو اہمیت دیتے تھے جو دینی عمل کے لئے ضروری یا کارآمد ہو سکتی تھیں۔ ان کے علاوہ دیگر سائنسیں ناکارہ اور گمراہ کن سمجھی جاتی تھیں۔ امام جنبل کے پیروکار ابن تیمیہ علم سے مراد وہ علم لیتے تھے جو پیغمبر ﷺ سے اخذ کیا گیا ہو۔ باقی سب کچھ ناکارہ تھا، خواہ اس کو سائنس کا نام ہی کیوں نہ دیا جائے۔

☆ امام جنبل کے ایک اور پیروکار زہابی ایک دانشور کی فصاحت کو داد تحسین پیش کرنے کے بعد حسرت سے کہتے ہیں کہ ”کیا اچھا ہوتا اگر وہ علوم الاوائل کو ترقی دینے سے گریز کرتا۔ ان کی وجہ سے مذہبی معاملات میں اس عوارض اور بربادی کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسے بہت کم ہیں جو علوم الاوائل کو اپنا کراس انجام سے محفوظ رہے۔“

☆ کٹر ملا ایسے دانشوروں کو انتہائی شبہ سے دیکھتے تھے جنہوں نے اپنے آپ کو فلسفی اور علوم الاوائل پر مباحثوں سے داغدار بنا لیا تھا۔ اس لئے اگر کوئی فلاسفر بستر مرگ پر بھی فلسفہ کی غلطیوں پر لعنت بھیجتا تھا اور ان دانشوروں سے منہ موڑ لیتا تھا، جن کو وہ عمر بھر مانتا رہا تھا، تو اطمینان کا اظہار کیا جاتا تھا۔ یہ اطلاع فاتحانہ انداز سے دی گئی کہ نابینا دانشور حسن ابن محمد بن نجیب العریلی (وفات 1268ء) فلسفہ سے تائب ہو گیا ہے۔ وہ ایک شیعہ فلسفی تھا اور دمشق میں اس کے مکان پر مسلمان اور دیگر اہل کتاب (عیسائی اور یہودی) فلسفی اس کے خطبات سننے جمع ہوتے تھے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ مرنے سے پہلے جو آخری بات اس نے کہی وہ یہ تھی: ”خدائے بزرگ و برتر سچا ہے ابن سینا جھوٹا ہے۔“

☆ 885ء میں بغداد کے تمام پیشہ ور نقل نویسوں سے قسم لی گئی کہ وہ فلسفہ کی کتابوں کو نقل نہیں کریں گے۔ اس کے متعلق ایک حقیقت کی طرف پروفیسر طبادی نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ یورپ میں کاغذ کا استعمال عربوں نے شروع کیا لیکن کاغذ پر کتابیں چھاپنے سے تین صدیوں تک خود عرب گریز کرتے رہے۔ خدا کے لفظ یا اس سے متعلق مواد کو مشین کے ذریعہ نقل کرنے کو بے ادبی سمجھا جاتا تھا۔

☆ امام حنبل کے پوتے عبدالسلام نے فلسفہ میں دلچسپی ظاہر کی تو اس کے دشمنوں نے اسے برباد کر دیا۔ خانہ تلاشی کے دوران اس کے گھر سے اخوان الصفا کے رسالے، جادو، جوش اور نجوم پر کتابیں اور سیاروں کے لئے دعاؤں کے کتابچے برآمد ہوئے۔ یہ سب عبدالسلام کے ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اس نے یہ بہانہ کیا کہ میں ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا اور میں نے تو یہ سب کتابیں ان کا رد لکھنے میں مدد کے لئے نقل کی تھیں۔ یہ سب کتابیں اور تحریریں علماء اور قاضیوں وغیرہ کی موجودگی میں خلیفہ کی مسجد کے محن میں ڈھیر کی گئیں اور پھر مسجد کے منبر سے یہ کتابیں فاضل عماندین کے سامنے آگ میں پھینکی گئیں۔ یہ منظر اس بڑے ہجوم نے بھی دیکھا جو مسجد کے سامنے جمع ہو گیا تھا۔ ایک شخص ہر کتاب کا عنوان پڑھ کر عبدالسلام کی موجودگی میں کہتا تھا کہ اس کتاب کے لکھنے اور اس پر یقین رکھنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔ ہجوم میں شامل لوگ لعنت بھیجتے تھے۔ یہ لعنتیں شیخ عبدالقادر اور امام حنبل پر بھی بھیجی گئیں کیونکہ عبدالسلام کو ان کا پیرو سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد عبدالسلام کو مرتد قرار دیا گیا، دستار فضیلت اس کے سر سے اتاری گئی اور شیخ عبدالقادر کا مدرسہ، جس میں عبدالسلام درس دیتے تھے، ابن الجوزی کو دے دیا گیا۔ زنداں سے رہائی کے بعد عبدالسلام نے گناہوں کا اعتراف کر کے توبہ کی۔

☆ اقلیدس (جیومیٹری) علوم الاوائل کا حصہ تھی اور اس نے راسخ العقیدہ دماغوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ اقلیدی اشکال سے وہ خصوصاً پریشان ہوتے تھے۔ ایک مقدمہ میں ایک ایسی کتاب کا مالک، جس میں اقلیدی اشکال تھیں، مرتد قرار دیا گیا۔ ایک اور مثال اس کٹر مذہبی شخص کی ہے جو نجوم و فلکیات پر ابن اہشیم کی کتاب میں بنی ہوئی اشکال سے ڈر گیا تھا۔ اس نے شبہ کیا کہ یہ شکلیں بے حیائی کی ترغیب، خاموش آفت اور اندھی بدبختی کی نمائندہ ہیں۔ (ریاضی) کی تجریدی سوچ کئی راسخ العقیدہ دماغوں کے لئے تکلیف دہ تھی۔ فرہنگ نویس ابوالحسین ابن فارس نے تجریدیت پر تنقید کرتے ہوئے ان غیر عرب دانشوروں پر نکتہ چینی کی ”جو اعداد و خطوط اور نقاط کے ذریعہ اشیاء کی ماہیت سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔“ ان لوگوں کی معقولیت میں نہیں سمجھ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایمان کو کمزور کر کے ایسے حالات پیدا کرتے ہیں جن سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔“

☆ کٹر ملا سائنسی طریقے سے نجوم و فلکیات کے مطالعہ کے خلاف تھے، گو کہ اس شعبے میں

سب قرار دیتے ہیں۔ مثلاً رینان سے مشہور تبادلہ خطوط میں سید جمال الدین افغانی نے اپنے ایک خط میں لکھا:

”السیوطی کے مطابق خلیفہ الہادی نے مسلم ملکوں میں سائنس کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے پانچ ہزار فلسفیوں کو مار ڈالا۔ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ مارے جانے والوں کی اتنی بڑی تعداد مبالغہ پر مبنی ہو سکتی ہے، یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ فلسفیوں کو قتل کیا گیا اور یہ اسلام اور اسلامی ملکوں کی تاریخ پر ایک خونخونی داغ ہے۔ میں عیسائی مذہب کی تاریخ میں بھی مماثل واقعات دیکھتا ہوں۔ مذاہب خواہ انہیں کسی بھی نام سے پکارا جائے، ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔“

☆ گو ابن خلدون بعض لحاظ سے قدامت پسند تھے، تاہم علوم کے متعلق مسلمانوں کے منفی رویے سے مایوس تھے۔ انہوں نے لکھا:

”جب مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو سعد ابن ابی وقاص کو بے شمار کتابیں اور سائنسی تحریریں ملیں۔ انہوں نے خلیفہ عمر ابن الخطاب کو لکھا کہ انہیں اجازت دی جائے کہ وہ یہ کتابیں اور تحریریں مسلمانوں میں مال غنیمت کے طور پر تقسیم کر دیں۔ جواب میں حضرت عمر نے لکھا، انہیں دریا برد کر دو۔ اگر ان میں صحیح ہدایت ہے تو اللہ نے ہم کو بہتر ہدایت دی ہے۔ اگر غلط ہے تو اللہ نے اس سے ہمیں محفوظ رکھا ہے۔“

ابتدائی دور کی راسخ الاعتقادیت، یقیناً علوم الاوائل اور عقلی سائنسوں کے صریحاً خلاف تھی۔ اس کے باوجود اس کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ مسلم معاشرے میں سائنسوں کو فروغ نہ پانے دیتی۔ سائنسوں کے خلاف رویہ میں شدت کا نقطہ اس وقت آیا جبکہ راسخ الاعتقاد علماء میں سب سے زیادہ بزرگ اور با اثر عالم امام غزالی نے راسخ الاعتقادیت کو آخری فتح سے ہمکنار کیا۔ ہم اب امام غزالی کی تعلیمات کا مطالعہ کریں گے۔

الغزالی کے ہاتھوں عقل پرستوں کی شکست فاش

جیسا کہ ہم نے بیان کیا، یونانی علوم کی دنیاوی اور آفاقی خصوصیات کے باعث ان کے خلاف اس وقت سے ہی آوازیں اٹھنے لگی تھیں، جس وقت سے انہیں اسلامی تمدن میں روشناس کرایا گیا تھا۔ لیکن مختلف نظریات میں مسابقت کے انتشار، منطق اور سائنس کے طریقہ ہائے کار

سے آشنائی کے فقدان اور مسلسل باہمی چپقلش کے باعث عقلیت پسندی کے خلاف نہ مسلسل تحریک چلائی جاسکی اور نہ ہی فیصلہ کن حملہ کیا جاسکا۔ یہ اس وقت ہی ممکن ہو سکا جبکہ عالم دین الغزالی (جن کے متعلق سید حسین نصر نے تشکر کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ وہ شخصیت ہے جس نے ”سائنس کو زیر کر کے راسخ الاعتقادیت کو بچا لیا)“ نے فلسفہ تعقل کو مربوط اور سمجھ میں آنے والے طریقے سے رد کرنے کی کوشش کی۔ علمی اور مقصدی انہماک کے ساتھ الغزالی نے اسلامی تہذیب و تمدن کو یونانی تصورات و خیالات کے خارجی اثرات سے پاک کرنے کے لئے انتھک کام کیا۔

ابوحامد الغزالی 1058ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں ہی انہوں نے دینیات کی تعلیم شروع کر دی۔ وہ جلد ہی دینی معاملات و مسائل کے وسیع علم اور گہری فہم کے لئے مشہور ہو گئے۔ انہیں بغداد کے جامعہ نظامی میں مدرس کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ یہاں انہوں نے ارسطو طالسی دانشوروں کی سائنسی اور فلسفیانہ کتابوں اور تحریروں کا مطالعہ کر کے یونانی علوم اور طریق کار پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کے بعد وہ ایک داخلی بحران میں مبتلا ہو کر تارک الدنیا ہو گئے۔ جب وہ دنیا میں واپس آئے تو ایک بدلے ہوئے انسان تھے۔ اب وہ تمام عقلیت پرست فلسفیوں، بشمول مادہ پرستوں، فطرت پرستوں اور طہدوں کے شدید مخالف تھے۔ غزالی ارسطو کو دوسروں سے بہتر سمجھتے تھے کیونکہ اس نے موثر طور پر افلاطون اور سقراط کے بعض تصورات کو رد کیا تھا، تاہم وہ بھی کفر اور لادینیت سے خود کو آزاد نہیں کر سکا۔ ارسطو کے مسلمان پیروکاروں کی مذمت میں الغزالی نے لکھا:

”اس لئے ہمیں ان فلسفیوں اور اسلامی فلاسفہ میں ابن سینا، الفارابی جیسے پیروکاروں کو لادین سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے ارسطو کے فلسفہ کو پھیلایا ہے۔“

الغزالی کے نظریات کتابوں کی کئی جلدوں پر محیط ہیں اور ان تمام مسائل سے بحث کرتے ہیں جو ازمنہ وسطیٰ کے ذہنوں میں کارفرما تھے۔ علت و معلول، تعقل، ریاضی اور منطق کے متعلق غزالی کے نظریات ہمارے لئے خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں کیونکہ ان نظریات نے ہی سائنس کے متعلق مسلمانوں کے رویوں کو متعین کیا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم سائنس کے ارتقاء سے متعلق غزالی کے رویوں کا جائزہ لیں گے۔

علت اور معلول کے متعلق غزالی کا نظریہ

آگ باعث ہے جلنے کا، بجلی باعث ہے کڑک کا، ہوائیں باعث ہیں لہروں کا اور کشش ثقل کے سبب چیزیں زمین پر گرتی ہیں۔ علت اور معلول کے درمیان یہ رشتے سائنسی تفکر کی بنیاد ہیں، خواہ وہ تفکر جدید ہو یا قدیم۔ لیکن اس تصور کو الاشعری نظریہ نے خصوصاً مسترد کیا ہے اور مادی تعلیل کے سب سے زیادہ موثر مخالف الغزالی ہیں۔

الغزالی کے نزدیک یہ یقین کرنا بے سود ہوگا کہ دنیا مادی قوانین کی پابند ہے۔ ان کے بقول ہر لمحہ اللہ تعالیٰ دنیا کو مٹاتا اور بناتا ہے۔ اس لئے ایک لمحے اور دوسرے لمحے کے درمیان تسلسل نہیں ہو سکتا اور یہ مفروضہ غلط ہوگا کہ ایک مخصوص عمل کا ایک مخصوص نتیجہ ہی برآمد ہوگا۔ اس کے برعکس، کسی بھی واقعہ کو کسی خاص مادی علت کا نتیجہ قرار دینا بھی غلط ہوگا۔ الغزالی کی دینیات کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام مادی واقعات و طریقہ ہائے کار کا براہ راست واحد سبب ہے اور وہ آفاق میں مسلسل دخل انداز ہے۔ وہ یہ بات اس مثال سے واضح کرتے ہیں کہ ایک ملحد روٹی کے جلنے کا سبب آگ کو قرار دیتا ہے لیکن:

”ہم اس سے انکار کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جلنے کا عمل خدا کی طرف سے ہے جو اس نے روٹی میں سیاہی پیدا کر کے اور اس کے حصول کو علیحدہ کر کے کیا ہے اور یہ خدا ہے جس نے روٹی کو جلایا اور اسے یا تو فرشتوں کے واسطے سے یا بلا واسطہ خاک کر دیا۔ کیونکہ آگ بے جان چیز ہے جس میں بجائے اور کوئی حرارت نہیں ہے اور اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہی (جلانے کی) عامل ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فلسفیوں کے پاس سوائے اس مشاہدے کے اور کوئی ثبوت نہیں ہے کہ آگ کے لمس سے چیزیں جلتی ہیں، لیکن یہ مشاہدہ دو کاموں کا بیک وقت ہونا ثابت کرتا ہے، اس سے تعلیل ثابت نہیں ہوتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی سبب نہیں ہے سوائے خدا کے۔“

ریاضی اور سائنس پر غزالی کے خیالات

دیگر علماء کے برعکس الغزالی نے قدرت سے متعلق سائنسوں کا مطالعہ کیا تھا، اس لئے وہ اس قابل تھے کہ مذہب سے ان سائنسوں کے رشتہ کا مستند تعین کر سکیں۔ اس مسئلہ پر ان کا مقام قطعی مخالفت کا نہیں تھا۔ ان کے بقول ریاضی کا کوئی بھی نتیجہ مذہب سے متعلق یا مربوط نہیں

ہے، اس لئے ریاضی ممنوعہ مضمون نہیں ہے۔ تاہم، الغزالی یہ دلیل دیتے تھے کہ ریاضی کئی خطرات کی طرف لے جاتی ہے اور اکثر و بیشتر عقیدے کو متزلزل کرنے کا باعث بنتی ہے:

”ریاضی سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ اول یہ کہ ہر طالب علم ریاضی کی صحت اور اس کے نتائج کے واضح ہونے کی تعریف کرتا ہے، اس لئے وہ فلسفیوں پر یقین کرنے لگتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ان کی دیگر سائنسیں بھی وضاحت اور ثابت کرنے کی صفت میں ریاضی سے مشابہ ہوں گی۔ دوئم، اس نے پہلے ہی ہر شخص سے ان کے الحاد خدا کی صفات سے انکار اور وحی کی صداقت کی تحقیر کے متعلق باتیں سنی ہوتی ہیں، اس لئے وہ ان کی سند کو مان کر خود بھی ان کی طرح کافر ہو جاتا ہے۔“

یہاں واضح دلیل یہ ہے کہ ریاضی امکاناً نہ کہ لازماً خطرناک ہے۔ خطرہ اس لئے ہے کہ وہ لوگ جو ریاضی کو پڑھتے ہیں، اس کی صحت کے حسن و قوت کے متوالے ہو سکتے ہیں اور اس طرح وحی پر ایمان کو فراموش کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک اور جگہ الغزالی زیادہ مضبوط رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ شدت سے اور لگی لپٹی کے بغیر ریاضی کی مذمت کرتے ہیں اور اس خیال کو مسترد کرتے ہیں کہ اس میں کوئی خوبی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ شراب بلاشک جسم کو طاقتور بناتی ہے۔ لیکن اس کے پینے کو واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ استدلال کیا جا سکتا ہے کہ شطرنج کے کھیل سے دماغ تیز ہوتا ہے، لیکن یہ بات اس کے کھیلنے کا جواز نہیں بن سکتی۔ الغزالی کہتے ہیں:

”بہی بات اقلیدس، الجسطی (فلکیات پر بطلموس کی کتاب) اور ریاضی و جیومیٹری کی باریکیوں کے بارے میں صحیح ہے۔ وہ دماغ کو تیز کرتی ہیں اور ذہن کو طاقتور بناتی ہیں، پھر بھی ہم ان سے اس سبب سے پرہیز کرتے ہیں کہ وہ علوم الاوائل کے مفروضے ہیں اور ان (علوم الاوائل) میں ریاضی و اقلیدس کے علاوہ وہ سائنسیں بھی شامل ہیں جو خطرناک نظریات کو ماننے کا تقاضا کرتی ہیں۔ جیومیٹری اور ریاضی دینی عقائد کے لئے ضرر رساں تصورات کی حامل نہ ہوں تو بھی ہمیں ڈر ہے کہ ان کے ذریعہ طالب علم ضرر رساں نظریات کی طرف راغب ہو سکتا ہے۔“

ہمعصر راسخ الاعتقاد علماء کے برعکس، الغزالی اصولاً منطق کے خلاف نہیں تھے۔ تاہم اس سلسلہ

میں وہ شدت اختیار کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ یہ ڈر تھا کہ کہیں ان کو ارسطو کا مقلد قرار دے کر تنقید نہ کی جائے۔ اس وجہ سے انہوں نے ”منطق“ کی اصطلاح استعمال کرنے کے بجائے اپنی کتابوں کو مبہم عنوانات دیئے۔ محمد ابن طلطلوس نے الغزالی کی سند کا حوالہ دیتے ہوئے منطق پر اپنی تحریروں کا دفاع اس طرح کیا ہے:

”ابو حامد نے اپنی کتابوں کے عنوانات اور ان میں استعمال کی گئی اصطلاحات کو تبدیل کر دیا۔ ایک مخصوص شعبے میں جو اصطلاحیں اس کے ماہرین عموماً استعمال کرتے ہیں، اس نے وہ تکنیکی اصطلاحات استعمال کیں۔ جن سے فقہا آشنا تھے اور جو اس عہد کے علماء اکثر و بیشتر استعمال کرتے تھے۔ یہ اس نے اپنے تحفظ اور ان دانشوروں کے تلخ تجربات سے بچنے کے لئے کیا، جنہوں نے عجیب اور غیر معمولی خیالات کا اظہار کیا اور جن کے باعث انہیں صعوبتیں اور ذلتیں برداشت کرنی پڑیں۔ اللہ کریم نے اس کو ان مصیبتوں سے محفوظ رکھا۔“

یہ ایک عجیب بات ہے کہ الغزالی کو آزاد خیالوں اور منطق کے حامیوں کے خلاف حملے کی قیادت کرتے ہوئے وہی ہتھیار استعمال کرنے پڑے جو مخالفوں کے پاس تھے۔ یعنی وہ یونانی طریق استدلال کے شدید مخالف ہونے کے باوجود بھی اپنی دلیلوں میں اسی طریق کو استعمال کرتے تھے۔

تجربیدی علم پر غزالی کا نظریہ

کائنات کے متعلق ایسے نظریے کے عہد میں، جس کی رو سے تمام معلومات کا منبع وحی یا الہام ہو، ہر عقلی تحقیق و تفتیش کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ مقدس لفظ کو صحیح و صادق ثابت کیا جائے اور اس کی حمایت کی جائے۔ ایسا علم جو ذہن و عقل کو مطمئن کرنے کے لئے ہو یا وہ علم جو کسی حقیقت کو ثابت کرنے اور انعام کے لئے ہو، ناقابل اجازت اور ناجائز ہے۔ تجربی علم کی طرف ایک جوان دانشور کے رجحان کو دیکھ کر الغزالی نے ان الفاظ میں سرزنش کی تھی:

”اے جوان! کتنی راتیں تم نے سانس کے ورد اور کتابیں پڑھنے میں جاگ کر گزاری ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اگر اس کا مقصد دنیاوی وسائل کا حصول، اس کے جاہ و تکبر کی تحصیل، اپنے ہم عصروں پر فوقیت حاصل کرنا یا ایسی ہی دیگر چیزیں ہیں تو تم پر لعنت، بار لعنت۔“

کیونکہ سائنس اور ریاضی کی تعمیر تجریدی خیال کی بنیاد پر ہوتی ہے اور انسانی تجسس غیر جانبدارانہ اور ”بے فائدہ“ تحقیق کا منبع ہے۔ الغزالی کی تنبیہ یقیناً ایسے مضامین کے مطالعہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔

اگلے باب میں ہم یہ بتائیں گے کہ تحقیق و خیال کی آزادی کے لئے مسلم سائنس کے دانشور بہادروں نے کیا مصائب برداشت کئے ہیں اور کیسی کیسی رکاوٹیں سر کی ہیں۔

MashalBooks.org

باب دس

پانچ بڑے بدعتی

ابتدائی طور پر اسلام کی اشاعت کے لئے جس طرح فتوحات اہم تھیں، اسی طرح دوسری تہذیبوں پر اسلامی تہذیب کی فوقیت قائم کرنے میں مسلمان دانشوروں کی شاندار کامیابیاں بھی خاص مقام رکھتی ہیں۔ ہمیں صرف یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ منگول حملے جو بظاہر عرب فتوحات سے مشابہ تھے، صرف ایک عارضی سلطنت قائم کر سکے لیکن کسی پائیدار اور مستقل تہذیب کو جنم نہ دے سکے۔ جب منگول حملہ آوروں کے جتھے بالآخر گوبی کے ریگستان واپس چلے گئے تو اپنے پیچھے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہ چھوڑا۔ اس کے برعکس اسلامی فتوحات نے دنیا کو ایک نیا تمدن دیا اور یہ تمدن مسلمانوں کا غلبہ ختم ہونے کے بعد بھی صدیوں تک پھولتا پھلتا رہا اور جاری و ساری رہا۔

پانچ صدیوں تک علم کی مشعل اسلامی تہذیب میں روشن رہی۔ دانشوروں کی ضوفشاں کہکشاں میں الکندی، ابن سینا، عمر خیام، ابن الہشیم، ابن رشد، ابن خلدون اور کئی دوسرے ستارے شامل تھے۔ ان نامور ہستیوں کے بغیر اسلامی تمدن و ثقافت کے مرقع کی خوبصورتی میں کمی رہ جاتی اور

اس دعوے کی سچائی مشتبہ رہتی کہ مسلمانوں کا تمدن دنیا کے عظیم تمدنوں میں سے ایک ہے۔ آج یہی ہستیاں ماضی کے کارناموں کا زندہ ثبوت ہیں۔ مسلم ملکوں میں مدرسوں کے بچوں کو ان کے بارے میں معلومات ہونی چاہئیں۔ تاریخ اور سائنس کی نصابی کتب میں ان کے کارناموں کی تعریف ہونی چاہیے اور ان کے ناموں پر انجمنوں، نیز اداروں کے نام ہونے چاہئیں، لیکن اس عظمت کے باوجود ان کے شاندار کارنامے اور شاہکار الماریوں میں بند ہیں۔ اسلام کے ان عظیم دانشوروں کو نہ تو منگول حملہ آور کافروں سے اور نہ ہی مشرک عیسائیوں سے خطرہ تھا بلکہ ان کو تو اپنے گھر کے اندر ہی پروان چڑھنے والی راسخ الاعتقادی اور بنیاد پرستی نے مارا تھا۔

کٹر مذہبیت اور دنیاوی علوم کے درمیان کشیدگی، جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں ذکر کیا ہے تقریباً اسی روز سے شروع ہو گئی تھی جبکہ اسلامی تہذیب میں یونانی علوم اور سائنسوں کا تعارف ہوا تھا۔ راسخ الاعتقاد علماء کی مخالفت، جو کبھی پوشیدہ اور کبھی اعلانیہ اور تشدد ہوتی تھی، ان دانشوروں کی زندگی کے لئے ہمیشہ خطرہ بنی رہی جو سائنس، فلسفہ اور منطق کا مطالعہ کرتے تھے۔ الجاحظ نے چیخ کر یہ کہا تھا کہ ”مذہبی علماء کی پارسائی صرف اس میں رہ گئی ہے کہ وہ مخالفوں کو منکر قرار دینے میں عجلت سے کام لیں۔ چنانچہ دانشوروں نے روشن دماغ خلفا اور حکمرانوں کی حمایت پر انحصار کیا تاکہ وہ طاقتور مذہبی ملاؤں کے غیظ و غضب سے محفوظ رہ سکیں۔ عموماً مذہبی علماء ان کی تحریروں اور سائنسی تحقیق کو بدعت قرار دیتے تھے۔ لیکن شاہی سرپرستی رشک و حسد اور کشیدگی پیدا کرتی تھی۔ مذہبی علماء کہتے تھے کہ کم رتبہ دانشور آسانی سے باختیار عہدے اور خلیفہ کی بارگاہ میں رسائی حاصل کر لیتا تھا۔ ایسے ماحول میں دانش اور سائنس کے کاموں میں رکاوٹیں اور مشکلیں حائل تھیں۔ عوام تک سائنس کو پہنچانا مشکل تھا۔ چنانچہ سائنس خواص تک ہی محدود رہی۔ شاید اسی وجہ سے ابن رشد نے یہ تعجب خیز اصول وضع کیا تھا کہ حکمران دانشوروں کی کتابیں عام لوگوں کے لئے ممنوع قرار دے دی جائیں۔

ہم اس باب میں یہ تذکرہ کریں گے کہ مذہبی کٹر پن کے مقابلے میں اسلامی دانشور کس طرح عہدہ برآ ہوئے۔

الکندی (801-873)

ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی ”عربوں کے فلسفی“ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہیں یہ

نام اس لئے دیا گیا کہ انہوں نے فلسفہ کو مذہبی علماء کے لئے قابل قبول بنانے کے واسطے انتھک کوشش کی۔ وہ اسلامی ارسطاطالیسی مکتب فلسفہ کے بانی اور منطق، ریاضی، طبیعیات اور موسیقی جیسے مختلف النوع مضامین پر دو سو ستر کتابوں کے مصنف تھے۔ وہ قدیم فلسفیوں میں شمار ہونے والے واحد عرب مسلم فلسفی ہیں۔ وہ پکے معتزلہ تھے۔ انہوں نے تحریر کیا کہ سچائی آفاقی اور اعلیٰ ترین ہوتی ہے۔ فلسفہ اس پیغام کی ایک اور شکل ہے جو پیغمبر لاتے رہے ہیں۔ الکندی کے نزدیک ”سچائی“ یا ”حق“ کے بہت واضح معنی تھے۔ وہ معنی جس کی تشریح افلاطون، ارسطو اور دیگر یونانی حکماء کرتے رہے ہیں۔ الکندی کے الفاظ میں دانشوروں کا کام ”اس کو اپنی زبان کے رائج قواعد اور اپنے زمانے کے دستور کے مطابق مقدور بھر مکمل کرنا ہے، جس کو قدماء نے پوری طرح واضح نہیں کیا تھا“۔

معقولیت پسند ہونے کی حیثیت سے الکندی نے یہ تجویز پیش کی کہ مقدس کتاب کی ان عبارتوں کو جن کی لفظی تفسیر حقیقت کے خلاف ہو، خردمند انسانوں کی رہنمائی کے لئے امثالیہ یا کنائیہ سمجھنا چاہیے۔ سارے قدیم فلسفی، بشمول الکندی یہ مانتے تھے کہ سچائیاں دو تھیں ایک سچائی احمق اور جاہل عوام الناس کے لئے تھی اور دوسری سچائی مہذب اور تعلیم یافتہ خواص کے لئے۔ الکندی کی رائے میں اول الذکر صرف سادہ بتوں کو سمجھ سکتے تھے، اس لئے انہیں راغب کرنے کے لئے حوروں اور دیگر مادی چیزوں کے تصورات ضروری تھے۔ دوسری طرف، آخر الذکر کو منطق اور تعقل سے نوازا گیا تاکہ وہ مقدس کتاب کے معانی کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں۔ امثالی تفسیر کو جائز ثابت کرنے کے لئے الکندی نے عقلی دلائل پیش کئے۔

امثالی استدلال کی ایک مثال قرآن کی ایک آیت ہے۔ اس آیت میں ایمان لانے والے کو بتایا گیا ہے کہ سورج، چاند، تارے، پہاڑ، درخت اور درندے اللہ تعالیٰ کو ”سجدہ کرتے ہیں“۔ اس آیت کو سن کر ایک غیر مہذب یا ناشائستہ شخص کے سامنے یہ تصور ابھرتا ہے کہ تمام مخلوق واقعی سجدہ ریز ہوتی ہے۔ لیکن الکندی ایک تفصیلی لسانی تشریح سے یہ دلیل دیتے ہیں کہ سجدہ کرنے سے مراد ہے حکم ماننا، اس لئے عام پرستش کے تصور کا مطلب خدا کے احکام کی عام پیروی یا تابعداری ہے۔ اس استدلال کو مزید وسعت دے کر الکندی کہتا ہے کہ ایک کائناتی قانون کا وجود ہے جس کی تعمیل مادے کی تمام جاندار اور غیر جاندار انواع پر فرض ہے، اس لئے

الکندی کے نزدیک کوئی چیز جو بظاہر روزمرہ کے تجربہ کے مطابق نہیں ہے، ایک ایسی چیز میں تبدیل کی جاتی ہے جو معقول ہے اور اگر مناسب طریقے سے اس کی تفسیر کی جائے تو عقل کو بھاتی ہے۔

المامون کے دربار میں الکندی دنیا کے ثقافتی مرکز کا سب سے زیادہ چمکدار ستارہ تھا۔ اس کی علمی سرگرمیاں المامون کے بعد اکتھم اور پھر الواثق کی حکومتوں کے دوران اپنی پوری توانائی کے ساتھ قائم رہیں، لیکن اس کے بعد جب راسخ العقیدہ سنی خلیفہ المتوکل تخت پر بیٹھا تو روشن خیالی کا طویل عہد ختم ہو گیا۔ نئے خلیفہ کو اس بات کا قائل کرنا چنداں مشکل نہ تھا کہ یہ فلسفی بہت خطرناک عقائد کا حامل ہے۔ متوکل نے جلد ہی الکندی کے ذاتی کتب خانے الکندیہ کو ضبط کرنے کا حکم صادر کیا۔ ساٹھ سالہ فلسفی کو سرعام پچاس سخت کوڑوں کی سزا دی گئی۔ ہر کوڑے پر ہجوم خوشی سے نعرے لگاتا تھا۔

3781ء میں، بہتر سال کی عمر میں وفات پانے سے بہت پہلے الکندی پر اداسی اور خاموشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ گو اس کے ایک دوست نے کسی ترکیب سے اس کو کتب خانہ دلوا دیا تھا، لیکن سرعام کوڑوں کی سزا کا قلق الکندی کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ اسلامی دانشوروں کے گردہ کا پہلا دانشور تھا جو عقلیت پسندی کے خلاف مذہبی کٹر پن کے رد عمل کا شکار ہوا۔

الرازی (865-925)

محمد ابن زکریا الرازی اسلامی دنیا کے سب سے بڑے طبیب گزرے ہیں۔ طب کے شعبہ میں ان کے عظیم کارناموں کے باعث ان کو ”جالینوس عرب“ اور ازمنہ وسطیٰ کی ذہین ترین شخصیت کہا جاتا ہے۔ ایرانی النسل الرازی نے طب کی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور بعد میں تہران کے نزدیک ایک شفا خانے کے مہتمم مقرر ہو گئے۔ وہ بہت ہمدرد معالج تھے۔ امیروں اور غریبوں کا یکساں خیال کرتے تھے۔

گو الرازی کی شناخت ان تحریروں سے ہوتی ہے جو انہوں نے زندگی سے متعلق علوم پر لکھی ہیں، تاہم وہ آزاد خیال فلسفی بھی تھے اور انہیں الکندی سے بھی زیادہ یونانی عقلیت سے لگاؤ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے مابعد الطبیعیاتی نظریات پیغمبرانہ صفات کے خلاف تھے کیونکہ وہ وحی والہام کو غیر اہم سمجھتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اپنی عقل کا ایک

حصہ سے ودیعت کر دیا اور اس طرح اسے مادی کائنات کو سمجھنے کے قابل بنا دیا۔ کائنات کی تخلیق کے متعلق الرازی کا نظریہ یہ تھا کہ ابتدا میں صرف خدا، روح، مادے، فضا اور وقت کا وجود تھا، اس کے بعد روح کی ایک تکلیف دہ صورت حال خدا نے مادی دنیا کے وجود میں داخل کی اور جب تمام روحیں عرش پر اپنے اصلی مسکن میں لوٹ جائیں گی تو دنیا کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔ کائنات کی تقدیر اور روح کے تنازع کا یہ تصور تخلیق کے عمومی تصور سے کوئی میل نہیں کھاتا تھا۔

مذہب کے متعلق الرازی کے غیر مقلدانہ نظریات نے اسے اکثر مسلم حلقوں میں غیر مقبول بنا دیا۔ بعد کے مصنفوں نے، گو اس کے علم و فضل اور تبحر کی تعریف کی لیکن اس کے کفر کی مذمت بھی کی کیونکہ وہ اعلانیہ عقلی استدلال کو وحی و الہام سے برتر سمجھتا تھا۔ نصر خسرو جیسے غیر مقلد اسماعیلی بھی الرازی پر کفر کا الزام دھرتے تھے۔ الرازی نے اپنی آزاد خیالی کی بھاری قیمت ادا کی۔ دانشوری سے معمور اس کی زیادہ تر کتابیں گمنامی کی نذر ہو گئیں۔ البیرونی نے بھی غالباً اپنے راسخ الاعتقاد مرئی کو خوش کرنے کے لئے الرازی کی اعلانیہ مذمت کی اور اس کی بینائی کے ضائع ہونے کو خدائی عذاب قرار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ بخارا کے قدامت پرست خاندان منصور کے ایک امیر نے الرازی کو ایسی سزا دی کہ اس کی بینائی ضائع ہو گئی۔

اس امیر نے پیش میں آ کر یہ حکم دیا کہ الرازی کے سر کو اس کی کتاب سے اتنا مارا جائے کہ یا تو اس کا سر یا کتاب ٹوٹ جائے، اس کے بعد الرازی کی بینائی ہی نہیں بلکہ زندگی کی خواہش بھی ختم ہو گئی۔ جب ایک معالج نے جراحی سے آنکھوں کے علاج کا مشورہ دیا تو الرازی نے جواب دیا ”میں نے اس دنیا کو بہت دیکھ لیا اور مجھے یہ خیال پسند نہیں کہ اسے مزید دیکھنے کے لئے جراحی کراؤں“۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد الرازی فوت ہو گیا۔

ابن سینا (890-1037)

ابوعلیٰ الحسین ابن سینا جدید دور کے نور برٹ ویز کی طرح قبل از وقت تخلیق پانے والا غیر معمولی ذہین شخص تھا۔ اس کے کارنامے اور تحریریں علم کے کئی شعبوں پر محیط ہیں۔ دس سال کی عمر میں اس نے قرآن شریف حفظ کر لیا تھا اور سترہ سال کی عمر تک وہ ایک تسلیم شدہ طبیب بن گیا تھا۔ ایک دو سال کے اندر اس نے ارسطو کی مابعد الطبیعیات پر عبور حاصل کر لیا۔ اس کا

شاہکار اصول طب (القانون) اس وقت تک طب کے شعبہ کی نصابی کتاب رہی جب تک کہ جدید طب وجود میں نہیں آگئی۔ لیکن اس زمانے کے حکیم صرف طبابت ہی نہیں کرتے تھے۔ ابن سینا قدیم اہل حکمت یا عقل مند شخص کی ایک بہترین مثال ہے۔ وہ انتھک کام کرنے والا تھا۔ اس نے فلسفہ، منطق اور طب کے شعبوں میں کام کیا اور اس کی کتابیں اور تحریریں علم کے ان شعبوں پر محیط ہیں۔

اسلام پر ابن سینا کا ایمان پختہ تھا لیکن وہ غیر مقلد تھا۔ اس کے ایمان کی قدرے غیر معمولی جھلک مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہوتی ہے۔ علمی تحقیق کے دوران اس کو بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا

”اگر میرے لئے مسئلہ بہت مشکل ہوتا تھا تو میں مسجد جا کر دعا مانگتا تھا اور تمام چیزوں کے خالق سے اس وقت تک التجا کرتا رہتا تھا جب تک وہ درجہ مجھ پر بند ہوتا تھا، کھل نہیں جاتا اور پیچیدہ مسئلہ میرے لئے سادہ نہیں بن جاتا تھا۔ ہمیشہ رات کے وقت میں گھر واپس آتا اور چراغ سامنے رکھ کر پڑھنے لکھنے میں منہمک ہو جاتا۔ اگر مجھ پر نیند طاری ہو جاتی یا میں جسمانی کمزوری محسوس کرنے لگتا تو شراب کے جام کا سہارا لیتا تا کہ میں تازہ دم ہو جاؤں۔“

یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ابن سینا توانائی حاصل کرنے کے لئے جس چیز کا سہارا لیتے تھے وہ ناجائز تھی اور ان کا یہ فعل غیر مقلدانہ تھا۔ اس سے ان کی شخصیت کی انفرادی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔

اپنے پیش رو الکندی کی طرح ابن سینا بھی نہایت آزاد خیال معتزلہ فلسفی تھے۔ ان کو بھی عقلی استدلال کی برتری پر اصرار تھا۔ کچھ عرصہ وہ امیر ہمدان کے وزیر رہے۔ وہاں فوج کے کچھ راسخ العقیدہ افسروں سے مذہبی بحث چل نکلی۔ یہ افسرانے ناراض ہوئے کہ انہوں نے ابن سینا کے قتل کا مطالبہ کیا۔ سپاہی ان کے گھر آئے اور انہیں نہ پا کر گھر کو لوٹ لیا اور امیر سے ان کے قصاص کا مطالبہ کیا۔ ابن سینا کو اس کارروائی کی بروقت اطلاع مل گئی تھی، چنانچہ وہ اپنے دوست ابو سعید دندق کے گھر میں روپوش ہو گئے اور یہیں انہوں نے اپنے شاہکار ”القانون“ پر کام کیا۔

ابن سینا کئی بار سزا سے بچنے کے لئے فرار ہوئے۔ ان کی کتابوں پر پابندی عائد کی گئی اور

بہت سے دشمن ان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ چنانچہ دوستوں نے انہیں اعتدال کا مشورہ دیا۔ جواب میں ابن سینا نے کہا: ”میں کم طویل لیکن زیادہ وسیع زندگی کو زیادہ طویل مگر تنگ زندگی پر ترجیح دیتا ہوں“۔ اور ابن سینا انتہائی جرأت کے ساتھ اپنے راستے پر چلتے رہے۔ مذہبی عقائد اور سائنس نیز منطق کے درمیان امتزاج کی کوشش نے بار بار ابن سینا کو علماء کے غیظ و غضب کا مستوجب ٹھہرایا۔ بدعت کے الزام کا ابن سینا کو رنج تھا، اس نے اپنا دفاع ایک مشہور نظم میں کیا ہے:

”مجھے بدعتی قرار دینا اتنا آسان اور اتنی چھوٹی بات نہیں ہے۔ مذہب میں مجھ سے زیادہ راسخ العقیدہ کوئی نہیں۔ اگر میں بھی بدعتی ہوں تو میں دنیا کی عجیب و غریب شخصیت ہوں۔ اگر میں بھی بدعتی ہوں تو دنیا میں کہیں بھی کوئی مسلمان نہیں ہے“۔

ابن سینا کے مسلسل احتجاج کے باوجود اسے علماء کے حلقوں میں نہ صرف اس کے اپنے عہد میں بلکہ بعد کی صدیوں میں بھی بدعتی سمجھا جاتا رہا۔ قدامت پرست مذہبی علماء میں سب سے زیادہ بااثر عالم امام غزالی نے بھی ابن سینا کو منکر قرار دیا:

”ارسطو کے فلسفہ کی اشاعت و ترویج کی وجہ سے ہمیں دو فلسفیوں ابن سینا اور الفارابی نیز ان کے پیروکاروں کو منکر قرار دے دینا چاہیے“۔

موجودہ دور کے بنیاد پرست بھی مسلمان دانشوروں اور سائنس دانوں کو مطعون قرار دینے میں پرانے زمانے کے علماء سے پیچھے نہیں ہیں۔ لندن سے سعودی امداد سے شائع ہونے والے ایک رسالے نے مندرجہ ذیل عتاب نامہ شائع کیا ہے

”الکندی، الفارابی، ابن الہشیم اور ابن سینا جیسے مشہور مسلمان سائنس دانوں کی کہانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے سوا ان کی ذات یا کام میں کچھ بھی اسلامی معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس، انکی زندگیاں نمایاں طور پر غیر اسلامی تھیں۔ طب، کیمیا، طبیعیات، ریاضی اور فلسفے میں ان کا کام یونانی مکتب خیال کی قدرتی اور منطقی توسیع ہے“۔

ایک ہندوستانی مسلم محمد کلیم الرحمان نے بھی کچھ ایسی ہی بات کہی ہے:

”فلسفیوں میں سے کئی یا تو معتزلہ یا لاادری تھے۔ ان میں سے کئی موسیقی، جوش اور جادو کے شوقین تھے۔ جو اسلام میں یا تو ممنوع ہیں یا جن کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔۔۔۔۔“

الرازی وحی پر یقین نہیں رکھتا تھا؛ الفارابی نیکی اور برائی میں تمیز کرنے کے لئے (شریعت پر نہیں) خالص عقلی استدلال پر انحصار کرتا تھا۔ اکلندی صفات مقدسہ سے منکر تھا؛ ابن سینا روز قیامت قبر سے جسمانی طور پر اٹھائے جانے پر یقین نہیں رکھتا تھا گویا رفتہ رفتہ معاشرے میں اسلامی اقدار کا فقدان ہونے لگا۔

جدید اور قدیم کٹر پن کے درمیان خیالات کا تسلسل یقیناً موجود ہے۔ یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اسلامی فلسفیوں کو معاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ بھی قابل غور امر ہے کہ ان فلسفیوں کے کارناموں کو محض یہ کہہ کر مسترد کر دیا گیا کہ ”یہ یونانی فلسفہ کی قدرتی اور منطقی توسیع ہے“۔ یہ انتہائی شدید تنقید چونکہ دینے والی حد تک مغربی تکتہ چینیوں کی اس تنقید سے مشابہ ہے جو وہ مسلمان سائنس دانوں کے کارناموں کو گھٹا کر بتانے یا ان کی تحقیر کے لئے کرتے ہیں؛ گو کہ ان کی اس تنقید کے اسباب بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اگر کسی غیر مسلم نے یہ الزام عائد کیا ہوتا کہ مسلم سائنس تو یونانی سائنس کا محض چربہ ہے تو مسلم سائنس کے راسخ العقیدہ تکتہ چیں اس الزام کو چیلنج کرتے۔ لیکن چونکہ مسلم سائنس کی توہین خود اسلام کے نام نہاد محافظوں نے کی ہے اس لئے اس پر کوئی رد عمل نہیں ہوا ہے۔

ابن رشد (1126-1198)

ارسطا طالیسی فلسفہ اور نشاۃ ثانیہ کے فلسفوں کے درمیان مضبوط رشتہ قائم کرنے کا اہم کام سرانجام دینے کے باعث ابوالولید محمد ابن رشد مغرب میں دیگر اسلامی فلسفیوں سے زیادہ مشہور ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے دانشوروں میں ابن رشد صف اول کے دانشور تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں فلسفیانہ مذہبی اور دینی کشمکش کے دوران کٹر عیسائی اور مسلم علماء ابن رشد کی تحریروں کو الحاد اور بدعت قرار دے کر اکثر نذر آتش کرتے رہے۔ ابن رشد کی تحریریں ارسطو پر مفصل و مضبوط تبصرہ تھیں؛ اس لئے ان کو یورپی دانشوروں نے لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ کیا۔ جلد ہی اس کے تبصروں پر تبصرے لکھے گئے۔ اس کی بیشتر تحریریں ان دو زبانوں میں ہی پائی جاتی ہیں۔ عربی میں لکھی گئی اصل تحریریں اور کتاہیں ناپید ہو چکی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک عقلیت پسند فلسفی کی حیثیت سے ابن رشد نے کس حد تک اپنے عہد کو متاثر کیا تھا۔ دیگر معقولیت پسندوں کی طرح ابن رشد پر بھی کٹر مذہب پرست مخالفوں کا عتاب اس نظر سے

گیا۔ خلیفہ کے حکم سے منطق اور سائنس کا مطالعہ ممنوع قرار دیا گیا۔ بعد میں ابن رشد کا قریبہ میں داخلہ بند کیا گیا۔ اسے اور فلسفہ کے طلباء کو بغیر کسی وجہ کے ایک چھوٹے سے صوبائی قصبہ میں بھیج دیا گیا۔ اس کی تمام کتابیں سوائے ان کتابوں کے جو خالص سائنسی موضوعات پر نہیں تھیں، نذر آتش کر دی گئیں۔ بارہویں صدی کے آخر میں پھر اس پر شاہی کرم ہوا اور وہ مراکش آیا جہاں اس نے وفات پائی۔ گوکہ ابن رشد نے الغزالی کی عقلیت دشمنی کا شد و مد سے مقابلہ کیا اور اس کا زور دار رد لکھا لیکن وہ اپنے عہد پر اثر انداز نہ ہو سکا۔

ابن خلدون (1332-1406)

مسلم تہذیب کا آخری عظیم دانشور عبدالرحمن ابن خلدون تھا۔ وہ انیسویں صدی تک گمنام رہا۔ اس صدی میں مغربی دانشوروں نے اسے انسانی کردار کی سائنس کے ماہر اور علم بشریات کے پیش رو عالم کی حیثیت سے دریافت کیا۔ خلدون سے مسلمانوں کی عدم توجہی کا سبب فلپ ہٹی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

”یہ فلسفی غلط عہد میں اور غلط مقام پر پیدا ہوا۔ وہ اپنے لوگوں کو ازمنہ وسطیٰ کے خواب غفلت سے جگانے کے لئے بہت تاخیر سے آیا اور یورپی لوگوں میں اس کو اپنا مترجم بھی دیر سے ملا۔ اس کا کوئی بلا واسطہ پیش رو تھا نہ براہ راست جانشین۔ کوئی مکتب خیال ایسا نہیں تھا جسے خلدونی کہا جاسکے۔ اس کی حیات عمل شمالی افریقہ کے آسمان سے اس طرح شہا بانہ گزری کہ اس نے اپنے پیچھے کوئی منعکس روشنی نہیں چھوڑی۔“

مورخ اور ماہر عمرانیات کی حیثیت سے اس کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹو آئن بی نے لکھا ہے کہ ابن خلدون نے ”تاریخ کے فلسفہ کی تخلیق و تدوین کی۔ یہ کام بلاشبہ اپنی قسم کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جو کسی بھی زمان و مکان میں سرانجام دیا گیا ہے۔“

ازمنہ وسطیٰ کے مسلم دانشوروں کی اکثریت کے برعکس ابن خلدون معتزلہ نہیں تھا۔ اس نے الفارابی اور ابن سینا جیسے مسلم نوافلاطونیوں کے مفروضوں کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ اس کی رائے میں علم الوجود ظہور اور علمیات (علم انسانی کے ذرائع اور مواد کا علم) پر ان فلسفیوں کے نظریات مذہب کے خلاف تھے۔ وہ الکیسما کا بھی شدید مخالف تھا۔ تاہم ایک ثبوتی (فلسفہ ثبوتیت کا قائل) کی حیثیت سے ابن خلدون نے اسلامی فکر میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اس نے

عمرانی کردار کے قوانین اور اصول دریافت کئے اور ارتقاء تہذیب کی سائنس بھی ابتدائی شکل میں پیش کرنے کا سہرا اس کے سر ہے۔ اس نے باقاعدہ تشریح کر کے یہ بتایا کہ کس طرح زمینی حالات جغرافیائی خصوصیات، انسانی آبادی کی صفات اور اقتصادی عناصر سماجی حالت کا تعین کرتے ہیں۔ ابن خلدون کا ایک قول خصوصاً بہت مشہور ہے۔ ”نسلوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ محض اس فرق کا اظہار ہوتا ہے جو ان کی اقتصادی حالتوں کے درمیان ہوتا ہے اور انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔“ اس قول کا مقابلہ مارکس کے اس قول سے کرنا چاہیے: ”زندگی کے مادی معاملات میں پیداواری طریقہ عمومی طور پر زندگی کے عمرانی، سیاسی اور ذہنی طریق کار کا تعین کرتا ہے۔“ بعض اہم اعتبارات سے ابن خلدون نشاۃ ثانیہ کے بعد آنے والے کئی یورپی حکماء کا پیش رو تھا۔

اس کے باوجود کہ ابن خلدون ایسے مسلم فلسفیوں کا سخت مخالف تھا جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھے بعض کٹر مذہبی علماء اسے ضرورت سے زیادہ عقلیت پسند سمجھتے تھے۔ خصوصاً یہ بات قابل اعتراض تھی کہ ابن خلدون نے عصبیہ (گروہ سے وفاداری) کے تصور کو پیغمبری پر لاگو کیا اور یہ کہا کہ مقدس وحی پر مبنی دین کو بھی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے قبائلی پختہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عرب دانشوروں کو یہ شکایت بھی تھی کہ ابن خلدون عربوں کے بے ڈھنگے پن (غیر مہذب برتاؤ) کے حوالے حقارت سے دیتا ہے۔ نیز یہ کہ سنہری دور کے شاندار کارناموں کا سہارا زیادہ تر غیر عربوں کے سر باندھتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ لکھتا ہے:

”یہ حقیقت قابل ذکر ہے کہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر زیادہ تر مسلم دانشور خواہ وہ دینیات کے ہوں یا عقلی علوم سے تعلق رکھتے ہوں، غیر عرب ہیں۔ اکثر و بیشتر عربی النسل دانشور زبان اور نشوونما کے اعتبار سے غیر عرب ہوتے ہیں یا پھر ان کے اساتذہ غیر عرب ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت اس بات کے باوجود ہے کہ اسلام ایک عرب مذہب ہے اور اس کا بانی عرب (پیغمبر) تھا۔“

ابن خلدون ایک ایسے یمنی خاندان کا چشم و چراغ تھا جس نے اندلس (اسپین) میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کبھی کبھی اس کے نکتہ چین اسے ازراہ حقارت ”جاہل بربر“ کہتے تھے۔ جواب میں ابن خلدون عربوں کو ایسی ”وحشی قوم“ کہتا تھا جس میں لوٹ مار اور غارتگری کے

رجحانات پائے جاتے ہیں۔

زیادہ تر مسلم دانشوروں نے ابن خلدون کو نظر انداز کیا ہے، لیکن بعض نے اس پر شدید تنقید کی ہے۔ مثلاً۔

☆ سیح شوکت (عراق میں تعلیم کا ڈائریکٹر جنرل اور جوانوں کی تنظیم کے فوجی شعبہ کا سربراہ) نے 3391ء میں بغداد میں اپنی ایک تقریر (جس کا عنوان ”موت کا پیشہ“ تھا) کے دوران کہا کہ ابن خلدون کی قبر کو کھود کر مسمار کیا جائے اور تمام عرب دنیا میں جہاں کہیں بھی اس کی کتاہیں ہوں ان کو جلایا جائے۔

☆ طہ حسین (جدیدت کا حامی مصری دانشور) ابن خلدون کو قابل نفرت، انا پرست اور ایسا بے ایمان عقلیت پسند قرار دیتا ہے جو مسلمان کا بہروپ دھارے ہوئے تھا۔

مسلمانوں میں علم و دانش کی روایت پر یہ حقیقت ایک داغ ہے کہ ابن خلدون اس وقت تک گمنام رہا جب تک کہ اس کو مغربی مستشرقین نے دریافت نہیں کیا۔ اور اب جبکہ اس پر ان مستشرقین نے اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی ہے، تو (عرب نسل پرستوں اور کٹر علما کو چھوڑ کر) کئی دانشور اس کی تعریف کرنے میں باہم مسابقت کر رہے ہیں۔

باب گیارہ

اسلامی دنیا میں سائنسی انقلاب کیوں نہیں آیا؟

ہر عظیم تہذیب اپنی تاریخ آپ لکھتی ہے۔ ماضی سے مخصوص حقائق کا انتخاب کر کے یہ ثابت کرتی ہے کہ بڑائی یا عظمت میں اس کا کوئی مقابل یا حریف نہیں ہے۔ ہمارے عصر کی غالب مغربی تہذیب نے بھی ثقافت، تمدن اور دانش کی تاریخ کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس میں یورپی نشاۃ ثانیہ کے عہد میں سائنسی اور تہذیبی ارتقا یونانی اور رومی افکار کی سیدھی اور تیز پیش رفت کے طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن گزشتہ چند دہائیوں کے دوران تاریخ کا پس منظر پہلے سے زیادہ وسیع ہوا ہے اور اب اس تقسیم کا آغاز ہو گیا ہے کہ سائنس کی جڑیں مختلف تمدنوں اور دنیاوی تہذیبوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ سارٹون اور نیدھم جیسے مورخین کے کام کی روشنی میں اب یہ ناممکن ہے کہ سائنس کے ارتقاء میں اسلامی، چینی اور ہندو تہذیبوں کے کردار کو نظر انداز کر دیا جائے۔

اس حقیقت کے پیش نظر کہ ہر بڑی تہذیب نے اپنے دور عروج میں انسانی علم میں قابل قدر اضافہ کیا ہے یہ مفروضہ درست معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی تہذیب سائنسی انقلاب لاسکتی تھی۔ لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں جدید سائنس کا آغاز ہوا لیکن مغرب ہی

کیوں؟ ماہر عمرانیات ویبر (جس کی تحریروں نے مشرقی تہذیبوں کے متعلق مغربی خیالات و نظریات کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے) کے خیال میں اس کا سبب یورپ کے اجتماعی ذہن کی برتری ہے۔ ویبر نے یہ تک کہنے سے گریز نہیں کیا کہ نسلی اعتبار سے یورپی لوگوں میں مقابلتاً زیادہ معقولیت یا عقل ہوتی ہے۔ اس لئے وہ معقول سرمایہ دارانہ اخلاقیات کی عاجلانہ ترقی کے اہل ہیں۔

اس قسم کے نسلی تعصب پر مبنی دلائل سنجیدہ بحث کے قابل نہیں ہیں؛ کیونکہ کئی غیر یورپی ملکوں میں جس تیزی سے سائنسی کلچر کی نشوونما ہوئی ہے وہ اس دعوے کی نفی ہے کہ سائنسی سوچ پر یورپی دماغ کو اجارہ داری حاصل ہے۔ پھر بھی کئی سوال ایسے ہیں جو جواب طلب ہیں اور جن پر بحث ہو سکتی ہے۔ خصوصاً یہ سوال کہ نوین اور تیرہویں صدیوں کے درمیانی عرصہ میں سائنسی انقلاب اسلامی تہذیب میں کیوں رونما نہیں ہوا؟

یہ سوال مہمل نہیں ہے۔ پانچ صدیوں تک اسلامی سائنس دان اور دانشور دنیاوی علوم میں رہنمائی کرتے رہے لیکن ان کی رسائی جدید سائنس تک نہ ہو سکی۔ آخر کیوں؟ اس ناکامی کے اسباب کی وضاحت ظاہر ہے قیاس پر مبنی ہوگی۔ کیونکہ کوئی ایسی تجربہ گاہ نہیں ہے جس میں یہ مشاہدہ کیا جاسکے کہ مختلف سماجی ماحولوں میں سائنسی ترقی کے جراثیم کیا اثر پیدا کرتے ہیں اور ان کی پرورش کے لئے کس قسم کے حالات اور قوت بخش عناصر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر انسانی معاشرے کی داخلی پیچیدگی اور اس پر خارجی اثرات کی مختلف النوع ماہیت کسی واحد عنصر کی علیحدگی کو خارج کر دے تو بھی دلائل اور وضاحت کی جزوی کوششیں بہت اہم ہو سکتی ہیں۔ ان سے مسلمانوں کی خصوصاً سائنسی پس ماندگی اور اس کے نتیجے میں سیاسی غلامی کے اسباب سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہ تقسیم اس لئے اہم اور ضروری ہے کہ مسلمانوں کی تعداد دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ اس باب کا عنوان جو ایک سوال ہے اس کا جواب دینے کے لئے اسباب کی پانچ امکانی اقسام پر غور کرنا شاید مفید ثابت ہو سکے۔

☆ وہ اسباب جو فلسفہ اور رویوں سے متعلق ہیں۔

☆ وہ جو تعلیم کے ایک خاص تصور کا نتیجہ ہیں۔

☆ وہ جو اسلامی قانون کی مخصوص نیچر کا نتیجہ ہیں۔

☆ وہ جن کا وجود بعض معاشرتی و معاشی اداروں مثلاً خود مختار شہروں یا پیشہ دارانہ تنظیموں کے فقدان یا ان کی کمزوری کی وجہ سے ہے۔

☆ وہ اسباب جو اسلام میں مخصوص سیاسی کردار کا نتیجہ ہیں۔

یہ دلیل دی جاسکتی ہے کہ ان اسباب میں سے کوئی بھی غیر مرکب اور بنیادی نہیں ہے، ہر سبب دوسرے پر اثر انداز ہے۔ مثلاً رویے اور فلسفے کسی معاشرے میں پیداواری قوتوں کی نفاست و شائستگی کی ترقی کے درجہ سے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ شہروں میں رہنے والے دیہات کے باسیوں سے سوچ، برتاؤ اور گفتگو وغیرہ کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی معاشرے کی اقتصادی ساخت میں جدید پیداواری قوتوں کے کامیاب انضمام کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ بعض ضروری رویے پہلے سے موجود ہوں۔ اسی طرح تعلیم ناگزیر طور پر موجودہ عقائد کی عکاسی کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تبدیلی کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم اس بحث میں الجھ جائیں کہ کیا علت ہے اور کیا معلول، ہمیں ان اسباب کی نشاندہی سے مطمئن ہو جانا چاہیے جو زیادہ معقول اور منطقی معلوم ہوتے ہیں۔

رویوں یا انداز فکر پر مبنی اسباب

ثبت و معقول علم کا حصول یا دوسرے الفاظ میں سائنس کی تحصیل کم و بیش اس مجموعی نظام فکر سے متعین ہوتی ہے جو کسی معاشرے میں کسی خاص وقت میں رائج ہوتا ہے۔ مجموعی نظام فکر میں عقائد، رویے، سماجی رسوم، عام مفروضے اور مخصوص مذہبی اور نظریاتی نقطہ ہائے نگاہ شامل ہیں۔ اور یہ وہ عناصر ہیں جن کو انسانی تاریخ میں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ جو لین بکسلے ان عناصر کو وہی اہمیت دیتا ہے جو حیوانی ارتقا میں ڈھانچے کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ ساخت فراہم کرتے ہیں، جس سے زندگی کی نشوونما کے لئے راستہ ملتا ہے اور جس سے طریق حیات متعین ہوتا ہے۔

عقلیت کا تصور نہ صرف سائنس کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ہر نظام فکر میں موجود ہوتا ہے گو کہ اس کی اہمیت مختلف نظاموں میں کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ عقلیت یا معقولیت کا مطلب کیا ہے؟ انیسویں صدی کے فلسفی نطشے نے ایک واضح تعریف پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

عقلیت تعلقات ربط کا وہ سانچہ ہے جو معلول (اثر) کے لئے علت (سبب) کا تعین کرتا ہے۔ معقولیت کی جڑیں تلاش کرنے کے لئے نطشے علمیات کی نفسیاتی و حیواناتی گہرائیوں میں جاتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ عقلیت یا معقولیت انسان کے ”ارادہ برائے طاقت“ کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک انسانی نفس میں یہ خواہش تسخیر تمام تخلیقی عمل کا نفسیاتی سرچشمہ ہے۔ اس خواہش کی تہذیب کے لئے عقلیت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی بھی حیوانی مخلوق اپنے ماحول کو تسخیر کرنا تو کجا، سمجھ بھی نہیں سکتی۔ ”ارادہ برائے طاقت“ سے محروم ہو کر انسان کی حیثیت محض ایک ایسے پھینے کی ہو جاتی ہے جو سمندر کی موجوں کے رحم و کرم پر ادھر سے ادھر تیرتا رہتا ہے۔

اس فلسفہ سے مسلح ہو کر ہم یہ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ کیا محرکات ہیں جو ایک معاشرے کو دوسرے معاشرے سے کم یا زیادہ درجہ تک سائنس کو پروان چڑھانے کے لئے اکساتے ہیں؟ اگر سائنس کو انسان کے ”ارادہ برائے طاقت“ کا نتیجہ سمجھا جائے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ افراد کی طرح معاشرے بھی اس داخلی قوت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ایک بار یہ مان لیا جائے کہ خدا کی مرضی (رضائے الہی) تمام تعلقات یا روابط کے سانچے کا حصہ ہے تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ روابط علل یا معقولیت کے لئے تلاش کی شدت میں کمی آجائے گی یعنی خارجی دنیا کے معاملات میں خدا کی مرضی کا جتنا زیادہ دخل ہوتا ہے اور رضائے مقدس پر فانی انسان کے ارادے کا جتنا کم اثر ہوتا ہے ”ارادہ برائے طاقت“ کی کارکردگی کے لئے اتنی ہی کم گنجائش ہوتی ہے۔ اگر رضائے مقدس کا دخل کلی ہو تو تجسس، تخیل، تصور اولوالعزمی جیسے الفاظ غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ وہ معاشرہ جو تقدیر پر صابر و شاکر ہو یا وہ سماج، جس میں روابط علل کے سانچے کا ضروری جزو و دنیاوی معاملات میں دخل کوئی مقدس ہستی ہو تو اس میں لازمی طور پر سائنسی ذرائع سے نامعلوم کی کھوج کرنے والے افراد کم پیدا ہوں گے۔ جب دانش و سائنس کی ترقی عروج پر تھی، تب اسلامی معاشرہ تقدیر پرست نہیں تھا۔ انسانی اختیار ماننے والوں (قدریہ) اور پہلے سے طے شدہ تقدیر پر یقین رکھنے والوں (جبریہ) کے درمیان شدید بحثیں عموماً اول الذکر کی فتح پر منتج ہوتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ تقدیر پرست الاشعری نظریات کو غلبہ حاصل ہوتا گیا، جس کے باعث اسلامی معاشرہ کا ”ارادہ برائے طاقت“ کمزور ہوتا گیا اور

سائنسی روح معدوم ہونے لگی۔ اشعر عقیدے کا تقاضا تھا کہ علت اور معلول کے درمیان تعلق سے انکار کیا جائے اور اس طرح عقلی خیال اور استدلال کی نفی کی جائے۔ اس عقیدے نے ”ثانوی علیت“ یعنی اس خیال کو بھی مسترد کیا کہ آخر کار خدا ہر چیز کے لئے ذمہ دار ہے لیکن یہ ذمہ داری ان قوانین کے ذریعہ ہے جو اس نے کائنات کے لئے وضع کئے ہیں۔

اشعری نظریات کی سائنس مخالف ماہیت ان کے اس اعتقاد سے ظاہر ہوتی ہے کہ کسی بھی قسم کی پیش گوئی ناممکن ہے۔ اشعری کہتے تھے کہ ایک تیز رفتار سے جاتے ہوئے تیر کے متعلق بھی یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ وہ کسی ہدف تک پہنچے گا یا نہیں؛ کیونکہ اس کے راستے میں اللہ تعالیٰ دنیا کو ایک لمحہ میں مٹاتا ہے اور دوسرے لمحے میں دوبارہ پیدا کرتا ہے۔ اس کے باوجود کہ ایک لمحہ میں تیر ایک خاص مقام پر تھا، یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے لمحے میں کہاں ہوگا؛ کیونکہ صرف خدا ہی جانتا ہے کہ دوسرے لمحہ میں وہ دنیا کو کیسی پیدا کرے گا۔ پچھلے ایک باب میں ہم نے سب سے زیادہ بااثر الاشعری الغزالی کے نظریات کا بھی تفصیل سے مطالعہ کیا ہے۔ جیسی روابط کے وجود کو شد و مد سے رد کرنے کی کوشش میں انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ روئی اس وجہ سے نہیں جلتی کہ اس کو آگ لگائی جاتی ہے بلکہ اس وجہ سے جلتی ہے کہ خدا داخل انداز ہو کر یا تو براہ راست یا اپنے فرشتوں کے ذریعے روئی کو جلاتا ہے۔ اس سلسلہ میں الغزالی اپنے ایک استدلال کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

”اور یہ دلیل ان لوگوں کے دعوے کی نفی کرتی ہے جو جانتے ہیں کہ آگ جلانے کی عامل ہے، روئی شکم سیری کی عامل ہے، دو اتدرستی کی عامل ہے، علی ہذا القیاس“۔

تقدیر پرست رویوں اور فیصلہ کی آزادی سے انکار کے غلبہ کے علاوہ سنہری دور کے بعد اسلامی سوسائٹی کے بڑھتے ہوئے افادیت پرست کردار نے بھی محض علم کے لئے حصول علم کی حوصلہ شکنی کی۔ ان اسباب کی بنا پر سائنسی انقلاب تو کیا آتا؛ دانشوری کے میدان میں آگے قدم بڑھانا بھی مشکل ہو گیا۔

علم و دانش کی ترقی کے ابتدائی دور میں افادیت پرستی (یعنی صرف فائدہ مند چیزیں اچھی ہیں) کو اسلامی معاشرہ پر غلبہ حاصل نہیں تھا۔ مثال کے طور پر؛ جب خلیفہ المامون نے بغداد میں بیت الحکمہ قائم کیا اور علوم و سائنس سے متعلق مخطوطات کی تلاش میں دور دراز کے ملکوں میں

سفیر بھیجے۔ اس کا مقصد مادی مفاد حاصل کرنا نہیں بلکہ عام بہبود و ترقی کا حصول تھا۔ ترقی یافتہ یا جدید ٹیکنالوجی کی صورت میں مادی فائدے کے امکان کا کوئی خیال نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں قدیم سائنس اور قدیم ٹیکنالوجی کے درمیان وہ رشتہ نہیں تھا جو آج ہے۔ گو کچھ استثنا بھی ہیں جیسے الکیمیا یا علم الادویات۔ علم کی قدر خصوصاً افادیت کی وجہ سے نہیں تھی۔ لیکن آخر کار یہ خیال تمام اسلامی معاشرے میں سرایت کر گیا کہ صرف عملی علم ہی فائدہ مند ہے اور اس طرح نظریاتی علم کی قدر میں کمی ناگزیر ہوگئی۔ رویہ میں یہ تبدیل مذہبی اعتقادات میں سختی اور دینیاتی تحقیق و تجسس کی ممانعت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئی۔

مسلمانوں میں نظریاتی علم میں عدم دلچسپی کا آغاز چودھویں صدی کے لگ بھگ ہوا اور ہمارے عہد تک جاری ہے۔ مسلم قرون وسطیٰ کا سب سے زیادہ مشہور مفکر ابن خلدون تک ان واقعات میں ہلکی سی دلچسپی ظاہر کرتا ہے جو اس کے عہد میں آس پاس کی دنیا میں ہو رہے تھے۔

”اطلاعات کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ فرانسیسیوں کے ملک کے شمالی ساحلی علاقے میں فلسفیانہ سائنسیں بہت مقبول ہیں۔ ان کے اصولوں کا احیا ہو رہا ہے۔ ان کی تعلیم کے کئی حلقے ہیں اور ان کے طلباء کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔“

لیکن ابن خلدون نے اسے نہ تو خطرناک واقعہ سمجھا اور نہ ہی فرانسیسیوں کے اتباع کی ضرورت محسوس کی۔ اس کے برعکس وہ فلسفہ اور الکیمیا کے مطالعہ کا شدید مخالف رہا۔ اس کا یہ رویہ اس زمانے کے عام رجحان کا عکاس ہے۔ یہ وہ عہد تھا جس میں مسلمان تحقیق و تجسس کی صفات سے محروم ہو چکا تھا۔

بعد کی نسلوں میں بھی تجسس کا فقدان رہا۔ عثمانی ترک بھی تجسس کی خصوصیت سے محروم رہے؛ گو کہ سولہویں عیسوی صدی میں انہوں نے ایک وسیع اور شاندار سلطنت قائم کر لی تھی۔ عثمانی حکمرانوں نے مغرب کی کچھ تکنیکی ایجادات کی افادیت کو ضرور تسلیم کیا اور ان میں کچھ کو حاصل بھی کیا؛ لیکن وہ خیال کی آزادی کی اجازت دینے یا یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ ٹیکنالوجی سائنسی سوچ کا نتیجہ تھی۔ یہ بات استنبول میں ہولی رومن ایمپائر کے سفیر غلسن دی ہین کے مشاہدے میں آئی تھی۔ 1560ء میں اس نے اپنے ایک خط میں لکھا:

”کوئی ایسی قوم نہیں جس نے دوسروں کی مفید ایجادات اختیار کرنے میں اتنی بے دلی اور تامل سے کام لیا ہو۔ مثال کے طور پر انہوں نے ہماری بڑی اور چھوٹی توپیں اور کئی دیگر دریافتیں اپنے استعمال میں لے لی ہیں۔ لیکن نہ تو وہ کتابیں چھاپ سکے ہیں اور نہ ہی انہوں نے عوام کے لئے بڑی گھڑیاں نصب کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انہوں نے مقدس صحیفے (یعنی مقدس کتابیں) اگر چھاپ لئے تو وہ مقدس صحیفے نہیں رہیں گے اور اگر انہوں نے عوام کے لئے بڑی گھڑیاں نصب کر دیں تو ان کے موزنوں کے اختیار اور قدیم مذہبی رسوم کی تقدیس میں کمی ہو جائے گی۔“

سائنس کی عجیب و غریب دریافتوں اور ایجادوں سے عثمانی ترکوں کی عام عدم دلچسپی کا اظہار سفیر مصطفیٰ حلی آفندی کی رپورٹ سے بھی ہوتا ہے جو اس نے 1748ء میں ویانا سے لکھی تھی۔ جب وہ وہاں تھا تو ترکی وفد کو شہنشاہ نے ایک رصد گاہ دیکھنے کی دعوت دی۔ اس رصد گاہ میں مختلف چیزیں رکھی گئی تھیں۔ ان سائنسی ایجادات سے آفندی اور اس کے ساتھی چنداں متاثر نہیں ہوئے۔

”----- تیسری اختراع شیشے کی چھوٹی بوتلوں پر مشتمل تھی۔ جن کو ہم نے یہ دیکھا کہ پتھر اور لکڑی پر ماری جاتی تھیں مگر وہ ٹوٹی نہیں تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے چقماق کے ٹکڑے ان بوتلوں میں (جن کا حجم انگلی سے زیادہ نہیں تھا) ڈالے تو وہی بوتلیں جنہوں نے پتھر کی ضرب برداشت کی تھی آٹے کی طرح ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ جب ہم نے اس کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جب آگ سے نکال کر شیشے کو سرد پانی میں ٹھنڈا کیا جائے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے۔ ہم اس بے ہودہ جواب کو فرانسسی کرتب سے تعبیر کرتے ہیں۔“

افادی رویہ ہندوستان کے مغلوں میں بھی تھا۔ جنہوں نے 1480ء سے 1857ء تک حکومت کی۔ 1857ء میں انگریزوں کی مکمل فتح کے بعد ان کا دور حکومت ختم ہوا۔ اکبر کے دور حکومت میں خاص طور پر فائدہ مند ٹیکنالوجی کا شوق تھا۔ زاویہ قائمہ کے دندانوں والے پیسے، شراب اور خوشبو کی تقطیر، چشموں اور دوربینوں کے شیشے، شورے سے پانی کو ٹھنڈا کرنا وغیرہ کی طرف اکبر کے دور میں توجہ دی گئی۔ سترہویں صدی کے وسط میں شاہی بیڑے کے لئے بڑی تعداد میں موجودہ دور کے جہازوں سے مشابہہ جہاز بنائے گئے۔ لیکن اس سب کے باوجود

اور مغل طرز تعمیر کی مسلمہ شان و شوکت کے باوصف، تاریخ مغلوں کو دانش اور تعلیم کے شعبوں میں قابل ذکر کارناموں، مثلاً یونیورسٹیوں، تجرباتی مشاہدہ گاہوں کو قائم کرنے یا مثبت مکتب خیال کی حوصلہ افزائی کرنے کا اعزاز نہیں دیتی۔

موجودہ دور میں بھی افادیت پرستی اور مخفی خلاف دانش رویہ مسلمانوں میں عام ہے۔ اس ضمن میں صدر ضیاء الحق کے مشیر سائنس ایم۔ اے۔ قاضی نے صاف صاف کہا ہے کہ:

”----- اسلام میں سائنس کے لئے سائنس اور علم کے لئے علم نہیں ہے۔ ہر چیز ایک ہی مقصد کے لئے ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ سائنسی علم کو عام انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے۔“

سعودیوں کو جدید ٹیکنالوجی کی فراہم کردہ آسائشیں تو بہت پسند ہیں لیکن سائنس کے اصولوں اور نظریات کے علم سے انہیں چڑ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سائنسی علم کی اس خاصیت سے ڈرتے ہیں کہ وہ انسانی ذہن کے درتے کھولتا اور اسے سوچ کی آزادی بخشتا ہے۔ اس لئے وہ ایسے معاشرے کے لئے خطرناک ہے جس میں طبقاتی اور وراثتی معاشی و سیاسی نظام رائج ہے اور جہاں سیاسی ارباب اختیار کو مذہبی بنیاد پر جائز ٹھہراتے ہیں۔

مسلم معاشرے میں افادی اقدار کا موجودہ غلبہ سائنس کی ترقی کے لئے اچھی فال نہیں ہے۔ جب لوگ صرف ان چیزوں کی پرواہ کریں جو کھلے طور پر اور بلا واسطہ فائدہ مند ہوں تو وہ مجرد خیال کو ترقی دینے کے قابل نہیں رہتے اور سائنس کے لئے ذہنی ذرائع تخلیق کرنے کی اہلیت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ مجرد خیال اور ذہنی صلاحیتیں ناگزیر طور پر ظاہر اور مفید سے دور ہی ہوتی ہیں۔ ایک ایرانی ماہر طبیعیات نے نہایت واضح طریقے سے یہ مسئلہ اس طرح بیان کیا ہے:

”صرف سچے روحانی معاشرے ہی سائنس کو ترقی دینے کے اہل ہیں۔----- افادیت پرست معاشرے کی جبلت میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ سچی روحانی اقدار کا ہمدرد نہیں ہوتا۔----- جس قوم میں بڑے فلسفی نہیں ہوتے، وہ کبھی بھی بڑے سائنس دان پیدا نہیں کرتی۔ ہیڈیگر کے بقول فلسفی وہ شخص ہے جو تئیر کے قابل ہے۔ یہی خصوصیت سائنس دان کی بھی ہوتی ہے۔ افادیت پرست شخص میں معجزے کی اہلیت نہیں ہوتی، اس لئے یہ توقع مشکوک ہوگی کہ وہ سائنس کو ترقی دے گا۔“

مسلم تعلیم کا کردار

کسی معاشرے کے مقاصد اور اقدار کا اظہار اس کے طریقہ تعلیم سے ہوتا ہے۔ طریقہ تعلیم کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ آیا معاشرہ تبدیلی یا انقلاب کو اہمیت دیتا ہے یا حال یا ماضی سے منسلک رہنا چاہتا ہے۔ نفس مضمون کی تفہیم کے لئے ہمیں واضح روایتی مذہبی تعلیم کا مقابلہ جدید دنیاوی تعلیم سے کرنا چاہیے کیونکہ ان کے تعلیمی فلسفوں اور ان کے مقاصد اور طریقوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

عمرانیات کی اصطلاح میں یہ (Ideal Types) یا تصوری نمونے ہیں۔ ہم روایتی مذہبی تعلیم کے خالص نظریہ بیان کا مقابلہ جدید تعلیم کے تصور سے کریں گے۔ مندرجہ ذیل گوشوارے میں فرق کو اختصار سے پیش کیا گیا ہے۔

روایتی تعلیم

- 1- عقلمندی (انگلی دنیا) کی طرف مائل۔
- 2- اسلامی عمرانیات میں شامل کرنے کا مقصد۔
- 3- قرون وسطیٰ سے نصاب تعلیم نہیں بدلا۔
- 4- علم کا انکشاف غیب سے ہوا ہے اس لئے علم ناقابل تغیر ہے۔
- 5- مقدس حکم کی وجہ سے علم حاصل کیا جاتا ہے۔
- 6- فرامین ہدایات اور مفروضوں کی نکتہ چینی اچھی نہیں سمجھی جاتی۔
- 7- تعلیم دینے کا طریقہ بنیادی طور پر حکمانہ ہے۔
- 8- حفظ کرنے کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔
- 9- طالب علم کی ذہنی ساخت مجہول اور اکتسابی ہوتی ہے۔
- 10- تعلیم عمومی ہوتی ہے۔

جدید تعلیم

- 1- مائل بہ دنیا یا دنیاوی۔
- 2- انفرادیت یا خودی کو ترقی دینے کا مقصد۔
- 3- مضمون میں تبدیلی کے مطابق نصاب میں تبدیلی۔

- 4- علم مشاہدے، تجربے اور استنباط کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔
- 5- علم چونکہ مسئلہ حل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے اس لئے حاصل کیا جاتا ہے۔
- 6- فرامین، ہدایات اور مفروضوں کی نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔
- 7- تعلیم دینے کے طریقے میں شاگرد کی شرکت ہوتی ہے۔
- 8- اہم تصورات کی تفہیم کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔
- 9- طالب علم کی ذہنی ساخت عملی اور مثبت ہوتی ہے۔
- 10- تعلیم تخصیص کی حامل اور کئی مضامین میں منقسم ہے۔

مثالی نمونے کا خیال ناگزیر طور پر غیر حقیقی ہوتا ہے، تاہم مذکورہ ابتدائی نمونے موثر انداز میں تعلیم کے بنیادی طور پر دو مختلف نظاموں کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عصری مسلم معاشرے کے تعلیمی نظام میں تفہیم کے بغیر حفظ کرنے کی عادت ان رویوں کی دین ہے جو روایتی نظام تعلیم سے ورثہ میں ملے ہیں۔ اس روایتی نظام میں (پہلے سے حاصل شدہ) علم کا اکتساب کیا جاتا ہے نئے علوم کو دریافت نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ ذہن کا رویہ مجہول اور اکتسابی ہوتا ہے، تخلیقی اور تجسس نہیں ہوتا۔ روایتی حاکمانہ ماحول کا عمرانی تلازمہ یہ ہوتا ہے کہ تمام معلومات کو ناقابل تغیر سمجھا جاتا ہے۔ جائز قرار دیئے گئے علوم کو حفظ کیا جاتا ہے اور انہیں ایک حد تک مقدس سمجھا جاتا ہے۔ روایتی انداز فکر میں مسائل حل کرنے کے ذریعہ کی حیثیت سے دنیاوی علوم کا تصور تک ناجائز ہے۔

استاد کے اقتدار و اختیار کا منبع چونکہ ایسا تھا جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے روایتی طریقہ تدریس ناگزیر طور پر حاکمانہ تھا۔ مغلوں کے عہد میں۔۔۔۔۔ اور گاؤں کے مکتب میں آج بھی۔۔۔۔۔ معلم یا استاد کے سامنے طلباء نیم دائرہ بنا کر قطاروں میں بیٹھتے تھے۔ کتاب کے متن پر تبصرہ کرنے یا تشریح و تبصرہ لکھوانے کے بعد وہ ان الفاظ کے ساتھ درس کا اختتام کرتا ہے کہ ”اور خدا بہتر جانتا ہے“۔ اس کے بعد طلبا استاد کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دے کر رخصت ہوتے ہیں۔

غیر متغیر اور حافظہ کو اہمیت دینے والے تعلیمی نظام کی جڑیں درس نظامیہ میں ہیں جو گیارہویں صدی میں نافذ کیا گیا تھا۔ درس نظامیہ کا نصاب نسل در نسل چلتا رہا۔ ہندوستان میں بھی اسے

کسی تبدیلی کے بغیر اپنایا گیا۔ زیادہ تر زور قرآن حکیم اور احادیث کو حفظ کرنے پر دیا جاتا تھا۔ چودھویں صدی میں مسلم مملکتوں میں تعلیم کا تقابلی مطالعہ کر کے ابن خلدون نے کہا تھا کہ صرف مسلم ہسپانیہ اور ایران میں شاعری، صرف ونحو اور ریاضی جیسے مضامین تعلیمی نصاب میں شامل ہیں۔ دوسرے مسلم ملکوں میں ایسے مضامین جن کا تعلق قرآن سے نہیں تھا اتنے زیادہ دنیاوی سمجھے جاتے تھے کہ انہیں بچوں کو پڑھانا مناسب نہ تھا۔ شاگرد اپنی تختی یا سلیٹ پر ایک شعر لکھ کر اسے حفظ کر لیتا تھا اور پھر اسے مٹا کر اس کی جگہ دوسرا شعر لکھ لیتا تھا۔ ایک پرانی کتاب میں لکھا ہے کہ عباسی خلفاء کے دور میں مدرسہ کے طلباء دن کے اول وقت قرآن پڑھتے تھے اور باقی وقت میں لکھتے رہتے تھے۔ درمیان میں تھوڑا سا وقفہ کھیل کود کے لئے ہوتا تھا۔ منگل کی سہ پہر اور جمعرات کی صبح اپنے لکھے ہوئے کی غلطیاں درست کرتے تھے۔

روایتی تعلیم نظام کے (جس میں رٹنے پر زیادہ زور تھا) اپنے معیار کارکردگی کے اپنے درجے اور اپنے مثالی نمونے تھے۔ اس سلسلہ میں جن لوگوں کا حوالہ دیا جاتا ہے ان میں کوفہ کے محمد ابن زیاد العربی بھی شامل ہیں۔ انہوں نے 840ء میں سمرہ میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سوطالب علموں کو درس دیا۔ وہ دس سال تک طلباء کو کتابوں کے حفظ کردہ متن اور اپنی تشریح لکھواتے رہے۔ ان کا حافظہ اتنا اچھا تھا کہ دس سال کے دوران کسی بھی طالب علم نے ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب، مخطوطہ یا تحریر یا کاغذ نہیں دیکھا۔ ایک اور مثال نویں صدی کا ایک مصنف بیان کرتا ہے۔ وہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ”مرانج کا حافظہ کئی لوگوں سے بہتر ہے۔ اس نے مجھ سے ایک تحریر لی اور اسے رات بھر میں یاد کر کے دوسرے دن مجھے سنا دیا۔ یہ تحریر تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل تھی“۔ ایک اور واقعہ ایک دانشور کے متعلق ہے جو درس دینے کے لئے بغداد سے سیدتان گیا تھا۔ کتابیں لا کر لے جانے کی زحمت سے بچنے کے لئے اس نے وہ تمام احادیث حفظ کر لیں جن کا حوالہ وہ لیکچروں کے دوران دینا چاہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پیغمبر ﷺ کے متعلق تیس ہزار احادیث کا حوالہ دیا؛ لیکن جن لوگوں نے ان احادیث کی سچ کی وہ صرف تین غلطیاں نکال سکے۔

تیرہویں صدی عیسوی کے لگ بھگ اسلامی دنیا میں علوم اور سائنس کے سنہری دور کا اختتام ہوا۔ اس کے بعد سے مسلم نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نصاب تعلیم اتنا محدود تھا کہ کٹر

قدامت پسند مغل شہنشاہ اورنگزیب نے بھی اپنے استاد پر مندرجہ ذیل الفاظ میں سخت نکتہ چینی کی:

”آپ نے مجھ کو کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھ کو بتایا کہ فرانسیسیوں کا ملک ایک چھوٹا جزیرہ ہے جہاں گزشتہ زمانے میں سب سے بڑا بادشاہ پرتگال کا حکمران گزرا، پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا اور اب انگلینڈ کا بادشاہ ہے۔ آپ نے فرانس اور ہسپانیہ کے بادشاہوں کے بارے میں بتایا کہ وہ ہمارے چھوٹے حکمرانوں کی طرح ہیں۔۔۔۔۔ معاذ اللہ! آپ نے جغرافیہ اور تاریخ کے علم کا کیسا مظاہرہ کیا، کیا یہ آپ کا فرض نہیں تھا کہ مجھے اقوام عالم کی خصوصیات، ان کے ملکوں کی پیداوار اور وسائل، ان کی عسکری قوت، جنگ و جدل کے طریقوں، رسم و رواج، حکومت کے طریقوں اور سیاسی حکمت عملیوں سے آگاہ کرتے؟ آپ نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ ایک شہزادے کو کس قسم کے علوم کی تعلیم اور کیسی تربیت درکار ہے۔ آپ نے میرے لئے صرف اتنا ضروری سمجھا کہ میں صرف ونحو کا ماہر بن جاؤں اور ایسے مضامین پڑھ لوں جو ایک قاضی (منصف) یا فقیہ (قانون دان) کے لئے مناسب ہیں۔“

اورنگزیب نے جس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے وہ تعلیم کا تنگ دائرہ ہے، جس میں عام معلومات اور طبعی سائنس یا مادی نظام فطرت کے متعلق علوم شامل نہیں ہیں۔ تعلیم پر دینیات کا غلبہ تھا۔ صرف ونحو اور ادب دینی تعلیم کے معاون مضامین کی حیثیت سے شامل تھے۔ شاہ ولی اللہ (وفات 1761ء) کا نجی نصاب تعلیم کا دائرہ پرانے نصاب کی بہ نسبت زیادہ وسیع تھا اور اس میں کچھ ریاضی، فلکیات اور طب کے مضامین شامل تھے۔ تاہم برصغیر کے مسلمانوں کی ترجیحات میں دنیاوی علوم کا درجہ ہمیشہ کم رہا۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں بھی کسی حد تک آزاد تحقیق، مشاہدہ یا تجربہ کی اجازت دی گئی، اسے مادے تک محدود رکھا گیا اور اس کو مذہبی یا ثقافتی شعبوں میں دخیل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ تعلیم کی یہ حالت انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک جاری رہی تا آنکہ انگریزوں نے ”یورپی سائنس“ کو متعارف کرایا اور برصغیر کے اسکولوں میں جدید انتظام اور حساب کتاب کے طریقے پڑھانے کا آغاز کیا۔ اس فیصلہ پر برصغیر کے دو بڑے فرقوں، ہندو اور مسلم کا رد عمل مختلف تھا۔ ہندوؤں نے اس فیصلہ کو خوش آمدید کہا اور انگریزوں سے تقاضا کیا کہ وہ بنیادی علوم کے مزید اسکول اور کالج قائم کریں۔ اس

کے برعکس، مسلمانوں نے برطانوی فیصلہ پر شک و شبہ اور ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ رد عمل اس وجہ سے بھی تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے صدیوں پرانے دور حکومت کو زبردستی ختم کیا تھا۔ اس لئے ”یورپی سائنس“ کو مسلمانوں کے مذہب اور ثقافت کی تباہی کا پرفریب ذریعہ سمجھا گیا۔ دوسری طرف انگریز سامراجیوں کے مخصوص تکبر نے بھی مسلمانوں میں انگریزی زبان سے نفرت اور سائنسی تعلیم کی مخالفت میں شدت پیدا کی۔ انگریز سامراجیوں نے اعلانیہ مسلمانوں کے پرانے سائنسی کارناموں کا مذاق اڑایا۔ مثال کے طور پر 2 فروری 1835ء کو لارڈ میکالے نے اپنی ایک تقریر میں حقارت سے مسلم طبی نظریات کا حوالہ دے کر کہا کہ یہ نظریات ”ایسے ہیں جن سے ایک انگریز بیطار (مویثی کا علاج کرنے والا) بھی شرمندہ ہوگا۔ علم فلکیات ایسا ہے کہ جس پر انگلش بورڈنگ ہاؤس اسکول کی لڑکیوں کو ہنسی آئے گی اور تاریخ ایسے بادشاہوں سے بھری پڑی ہے جو تیس فٹ اونچے تھے اور جنہوں نے تیس ہزار سال تک حکومت کی اور جغرافیہ ایسا جس میں سمندر شیرے اور مکھن کے ہوتے ہیں“۔

مجروح عزت نفس، انگریزی راج کے خلاف سرکشی اور قدامت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں نے جدید تعلیم کو مسترد کر دیا۔ خصوصاً مسلم علماء شدید مخالف تھے۔ اور 1835ء میں میکالے کے اس فیصلے کے بعد کہ تمام ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز کیا جائے کلکتے میں آٹھ ہزار علماء نے ایک درخواست پر دستخط کئے، جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ 1857ء کے خون خرابہ کا ایک سبب جدید تعلیم کے متعلق قانون بھی تھا۔ والدین نے اپنے بچوں کو جدید اسکولوں سے دور رکھا۔ وہ بچوں کو یا تو گھر میں رکھتے تھے یا مدرسوں میں بھیجتے تھے۔ بہت کم تعداد میں ایسے والدین تھے جنہوں نے جدید تعلیمی ادارے پر پابندی کی خلاف ورزی کی۔ ایسے والدین کو سماجی دباؤ دھمکیوں اور لعنت ملامت کا شکار ہونا پڑتا تھا، گزشتہ عہد مغلیہ کی شان و شوکت کے عادی مسلمان علمی پیشوں، حساب کتاب اور کھاتہ داری کو کم ذات ہندوؤں کا کام سمجھتے تھے۔ ایسے علم مخالف ماحول میں سید احمد خاں نے مسلمانوں میں تعلیمی اصلاح کے لئے جدوجہد شروع کی اور اس جدوجہد میں وہ صرف جزوی طور پر کامیاب ہوئے۔

روایتی تعلیم کا ناگزیر نتیجہ یہ تھا کہ تفہیم کے بغیر لٹ لیا جائے اور حاکمیت کی خصوصیت کو فروغ

دیا جائے۔ اس قسم کی تعلیم ایسے معاشرے کے لئے فطری ہوتی ہے جو بذات خود متوازن ہو۔ لیکن جب معاشرہ ترقی کر کے پیچیدہ ہو جائے تو وہ پرانے نمونوں اور طریقوں کی سختی سے پابندی نہیں کر سکتا اور اسے ایسے حل تلاش کرنے پڑتے ہیں جو تاریخی اور ثقافتی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے ترقی کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ روایتی نظام تعلیم بدلتی دنیا کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے کے قابل نہیں تھا اور غالباً یہ وہ اہم ترین سبب تھا جس نے مسلمانوں کو سائنسی انقلاب کی قیادت سے محروم کر دیا تھا۔

مسلم قانون کا رول

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسی اور صنعتی انقلاب لانے والے صرف فلسفی اور دانشور ہی نہیں تھے۔ یہ ایک نہایت پیچیدہ معاشی اور عمرانی عمل بھی تھا۔ ٹیکنالوجی کے شعبہ میں ترقی نے یقیناً بہت طاقتور جدید وسائل پیداوار کو جنم دیا، لیکن یہ یورپ کے سرمایہ داروں کا طبقہ تھا جس نے ٹیکنالوجی کی ترقی کو کام میں لا کر آخر کار جاگیر داری معاشرہ کو جدید سرمایہ دار معاشرہ بنا دیا۔ مارکس کی زبان میں سرمایہ دار طبقہ وہ ہے جو پیداواری وسائل کے درمیان تال میل پیدا کرنے اور جدتیں کر کے نیر صنعتوں میں سرمایہ لگا کر بنیادی ساختہاتی یا تنظیمی تبدیلیاں لانے کا اہل ہوتا ہے۔ مارکس معاشرے کی تبدیلی میں سرمایہ دار طبقے کے اہم کام کو مانتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس طبقہ کو محنت کش کا استحصال کرنے والا اور ان کا فطری دشمن بھی قرار دیتا ہے۔

یہ سوال کہ سائنسی انقلاب اسلامی معاشرے میں کیوں نہیں آیا؟ عملاً اس سوال کے مترادف ہے کہ اسلام نے ایک سرمایہ دار طبقہ کیوں پیدا نہیں کیا؟ خصوصاً وہیبر اور اس کے پیروکار کا استدلال یہ ہے کہ اسلامی قانون کی نیچر اور اس قانون پر عمل پیرا ہونے کا انداز ایسا رہا ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کی پیدائش اور ابتدائی سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ ہم اب اس استدلال کو پرکھیں گے۔

وہیبر کا استدلال کچھ اس طرح ہے! سرمایہ دار طبقہ کے وجود کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایک نظام قانون ہو جس کے تحت حقوق جائیداد معاہدوں کے فرائض، بینکنگ اور مالی سودوں کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے تنازعات نپٹائے جاسکیں۔ منصفوں کے من مانے شخصی احکام

طور پر اس فرق پر مبنی ہے جو مختلف قرآنی آیات کو کم یا زیادہ اہمیت دینے کے باعث پیدا ہوا ہے یا پیغمبر کی مختلف احادیث کو کم یا زیادہ صحت کا درجہ دینے کے سبب وجود میں آیا ہے۔ ان مکاتب فقہ کے درمیان اسلامی قانون کے تمام بڑے مسائل گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک طے کر لئے گئے تھے۔ اس کے بعد اجتہاد کا دروازہ باقاعدہ اور ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

بائیں ہمہ مسلم معاشرے میں اقتصادی ارتقا کی سمت طے کرنے کے سلسلے میں شریعت کے واقعی اثر کا استنباط محض دلائل سے نہیں کیا جاسکتا۔ عملاً صدیوں سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ جب کبھی بھی اہم اقتصادی یا سیاسی مفادات داؤ پر لگے ہیں، مسلمانوں نے شریعت کے مختلف اوامر و نواہی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ فرانسیسی ماہر اسلامیات میکس روڈن کہتا ہے کہ مثال کے طور پر روپیہ قرض دینے کی اسلامی ممانعت پر کبھی بھی بڑے پیمانے پر عمل نہیں کیا گیا اور مسلم معاشرے سے سود خوری ختم نہیں ہوئی۔ اس ممانعت کا عملی اثر یہ ہوا کہ اسے ناکام بنانے کے لئے عجیب و غریب تاویلات اور طریقے اختراع کئے گئے۔ ایسے طریقے کا عربی نام ”حیل“ یعنی حیلہ سازی ہے۔ کتابیں جن میں بعض نویں صدی تک کی ہیں، حیل کی مختلف شکلوں پر لکھی گئی ہیں۔ روڈن کی کتاب ”Islam and Capitalism“ (اسلام اور سرمایہ داری) میں ”حیل“ کی گزشتہ اور موجودہ عملی صورتوں کا مسحور کن بیان ملتا ہے۔ تاہم اس سے انکار ناممکن ہے کہ شریعت نے بینکنگ کے ادارے کو اسلامی معاشرے میں اس طرح ارتقا پذیر نہیں ہونے دیا جس طرح وہ اس زمانے میں یورپ میں ہو رہا تھا۔

یہ دیکھ کر ویر کے استدلال کی کلی صحت پر شک ہونے لگتا ہے کہ جدید دور میں شریعت کے اوامر و نواہی پر عملی یا کاروباری مفادات کا موثر غلبہ رہا ہے۔ بین الاقوامی تجارت، مشترک سرمایہ کمپنیاں، غیر ملکی قرضے، محصول کے اصول وغیرہ میں بھی اسلامی قانون کے اوامر و نواہی متاثر ہوتے ہیں، لیکن ان کو طے کرنا تو کجا، انہیں نہ تو سنجیدگی سے اٹھایا گیا اور نہ ہی زیر بحث لایا گیا۔ تاہم تمام اسلامی ملکوں میں غیر مبہم قاعدے تو انہیں ان اقتصادی معاملات و مسائل کے متعلق وضع کئے گئے ہیں جو دنیاوی اور آفاقی قانونی اصولوں پر مبنی ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون کے تحت اسلامی ملکوں پر غیر اسلامی یا اسلامی ملکوں سے سودی قرضے لینے پر

پابندی ہونی چاہیے لیکن عملاً شریعت اس مسئلہ کے متعلق رویوں پر اثر انداز نہیں ہوئی ہے۔ عملی طور پر جدید اسلامی ریاستیں داخلی معاملات میں شریعت نافذ کرنے کے متعلق صرف زبانی جمع خرچ کرتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر، بعض راسخ الاعتقاد یا بنیاد پرست علما تصویر کھنچوانے پر پابندی کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ تاہم، اس اصرار کے باوجود جدید ریاستوں نے نہ تو تصویر کشی کا رڈوں کا اجرا بند کیا اور نہ ہی ٹیلی ویژن کا نظام ترک کیا۔ گو علما ضبط تولید کو خلاف مذہب قرار دیتے ہیں لیکن خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعہ آبادی میں اضافے کو قابو میں رکھنا ہر ریاست کی ضرورت ہے۔

ایسی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں مذہبی ارباب اختیار نے بھی شریعت کی روح کی خلاف ورزی کی ہے۔ حالیہ مثال پاکستان میں نہایت سخت مذہبی صوبہ سرحد کے مقامی علما کی ہے، جنکی بھاری اکثریت نے ہیروئن کی تجارت کو جائز قرار دیا ہے۔ منشیات کی تجارت کی حمایت کے لئے علما نے جو دلائل دیئے ہیں، وہ کلی طور پر غلط تاویل کے مترادف ہیں۔ ظاہر ہے کہ وقت آنے پر مادی مفادات اخلاقی اور دینی اصولوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔

آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر اسلامی علاقوں میں نسبتاً زیادہ عقلی اصولوں پر مبنی مقررہ قواعد و قوانین ہوتے تو وہ سرمایہ داری نظام کے ارتقاء میں مددگار ثابت ہوتے، تاہم ایسی کوئی مضبوط شہادت موجود نہیں ہے کہ عملاً صرف شریعت نے اس ارتقاء میں کوئی رکاوٹ ڈالی ہو۔ اس لئے جدید صنعتی اسلامی کلچر کے عدم ارتقاء کے اسباب کا پتہ لگانے کے لئے ہماری تحقیق یہاں ختم نہیں ہوتی۔

اقتصادی اسباب

جب اٹھارہویں صدی عیسوی میں سامراجی طاقتوں نے مسلم علاقوں کو فتح کر کے اپنی نو آبادی بنایا تو اس وقت مسلم معاشرہ قرون وسطیٰ کی منجمد کیفیت میں تھا۔ کوئی ایسا مسلم سرمایہ دار طبقہ موجود نہیں تھا جو جاگیر داری معاشرے کو سرمایہ دار معاشرے میں تبدیل کر سکتا۔ تاہم، بعض اوقات یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ نو آبادی بنائے جانے کے وقت ہندوستان اور مصر سرمایہ دارانہ سماجی و معاشی نظام کی طرف پیش رفت کر رہے تھے۔ سامراج کے نو آبادیاتی غلبہ نے ان کی اس پیش رفت کو روک دیا۔ یہ دعویٰ مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن دو اہم عناصر دیسی سرمایہ دار

طبقہ کے ارتقاء میں رکاوٹ تھے: اول ایسے شہری حکمران طبقہ کا وجود جو کسانوں کے استحصال پر مبنی تھا، دوئم خود اختیاری کے حامل شہروں اور پیشہ دارانہ تجارتی انجمنوں کا فقدان؛ جنہوں نے یورپ میں سرمایہ داری نظام کے ارتقاء میں کلیدی کام کیا تھا۔ ہم ان دو عناصر کا مندرجہ ذیل سطور میں تفصیلی جائزہ لیں گے۔

استخراجی اقتصادیات

خواہ وہ عثمانی ترکوں کے زیر نگیں عرب ممالک ہوں، خواہ مغلوں کے تحت ہندوستان ہو، اسلامی تہذیب قطعی طور پر مدنی یا شہری رہی ہے۔ گاؤں کے لوگ شہروں کو اپنی زرعی پیداوار ضروری فروخت کرتے تھے لیکن شہری تہذیب سے ان کا تعلق بہت کم رہتا تھا اور وہ تہذیبی مرکز سے دور اپنی الگ تھلگ دنیا میں پس ماندہ زندگی بسر کرتے تھے۔ خلفاء اور بادشاہ مقامی صوبیداروں اور افسروں کا تقرر کرتے تھے۔ جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ کسانوں سے مالیہ اور غلہ وصول کر کے مرکز کو بھیجتے رہیں۔ قسط سالی میں بھی شہروں کی حالت گاؤں سے بہتر ہوتی تھی۔

دیہات پر شہروں کے طفیلی انحصار اور مالیہ و غذا کی یقینی فراہمی کے باعث پیداوار میں ٹیکنالوجی کے ذریعہ اضافہ کی ضرورت کا احساس بہت کم تھا۔ قبل از سرمایہ داری نظام کے اس معاشرے میں پیداوار کا مقصد فوری استعمال تھا، گوکہ یہ مقصد معاشرے کے رواج اور مروجہ سلسلہ مراتب پر مبنی سماجی نظام کے تابع تھا، نئی پیداواری قوتوں کی بہتری یا ارتقا مقصد نہیں تھا۔ اقتصادیا استخراج یا استحصال کے نظام کی پائیداری سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گو مغلوں کے دور میں ہندوستانی معاشرہ کئی اعتبار سے بہت اچھا تھا، لیکن بنیادی طور پر یہ قرون وسطیٰ کا جاگیردارانہ نظام تھا۔ ہندوستان میں سائنس کی تاریخ پر علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور دانشور عرفان حبیب نے کافی تحقیق کی ہے۔ وہ اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ مغل اشرافیہ اور دانشوروں نے مشینی آلات کے متعلق علم حاصل کرنے میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیوں کیا؟

”اس کی ایک وضاحت مغل اشرافیہ کی معاشی حالت سے ہوتی ہے۔ مغل حکمران طبقہ ایک ایسے پائیدار داخلی نظام پر منحصر تھا جس میں فاضل زرعی پیداوار بزور حاصل کی جاتی تھی۔ فروخت کے ذریعہ خام پیداوار اور غذائی اجناس شہروں میں منتقل کی جاتی تھیں اور شہروں میں ایسے لوگوں کی بڑی مدنی آبادی رہتی تھی جو دستکاریاں، مصنوعات اور ہر قسم کی خدمات پیش

مستقل اور سخت سرپرستانہ نظام کے تحت نہیں تھے۔ سرمایہ داری نظام کی نشوونما کے فروغ کو ویر عیسائیت کی مخصوص نیچر کے کھاتے میں بھی ڈالتا ہے لیکن اس دعوے کی حمایت میں اس کے دلائل قائل کرنے والے نہیں ہیں۔ البتہ یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے کہ خود مختار عمرانی اداروں نے سرمایہ داریت کی نشوونما پر اثر ڈالا ہے۔

اس سیاق و سباق میں اسلامی شہری زندگی کی روایت یورپی شہری زندگی سے مختلف رہی ہے۔ مسلم ملکوں میں شہروں پر حکمران خاندان کا خارجی اختیار ہوتا تھا۔ فوج، معاملات اور موصلات ان کے تحت ہوتے تھے۔ خارجی اختیار کا مطلب یہ تھا کہ بلدیاتی ادارے (Municipal Institutions) یا تو وجود میں نہیں آئے یا شہری زندگی کے کاروبار میں ان کو بہت کم دخل تھا۔ اس لئے عرب ملکوں اور مغل ہندوستان میں شہر ایک متحدہ کل نہیں تھا بلکہ مختلف قسم کے خلیوں کا ایک مجموعہ تھا اور یہ خلیے مسجدوں یا دیگر سماجی سہولتوں کا انتظام کرتے تھے۔ کسی خاص گروہ یا فرقہ سے تعلق عمرانی شعور کا اہم جز تھا۔ اس عمرانی ساخت کے عناصر آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ کہا جاتا ہے کہ گوشہری زندگی کی انتشاری نیچر کے باعث جماعتی ادارے نشوونما نہیں پاسکے تاہم مسلمانوں کی دستکاری انجمنیں یورپی شہروں کی پیشہ ورانہ انجمنوں سے مماثل تھیں۔ درحقیقت اسلامی معاشرے میں پیشوں کی انجمنیں یا جماعتیں نویں صدی عیسوی سے موجود رہی ہیں۔ ان میں جوہریوں (سناروں) طبیبوں (ڈاکٹروں) استادوں، بہشتیوں، تاجروں ہی نہیں بلکہ طوائفوں اور چوروں تک کے پیشوں کی انجمنیں شامل ہیں۔ تاہم پیشہ وروں کی انجمنوں پر خارجی حکمرانوں کو نسبتاً کافی زیادہ اختیار حاصل تھا۔ غالباً اس اختیار کا خاص مقصد یہ تھا کہ انجمنوں کو محصول کی ادائیگی کے مخالف مراکز بننے سے روکا جائے۔ چنانچہ پیشہ ورانہ انجمنوں کو ریاست قائم کرتی اور ان پر اختیار رکھتی تھی۔ ریاست ہی ان کے فرائض، دائرہ کار، تنظیم، تربیت، مصنوعات کی اقسام اور معیار اور قیمت فروخت کا تعین کرتی تھی۔ ریاستی اختیار کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 1807ء میں استنبول کے موچیوں کو سختی کے ساتھ یہ حکم دیا گیا تھا کہ جوتے کا پنچہ نوک دار نہ بنائیں کیونکہ اس شکل کے جوتے قدیم روایت کے مطابق نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی پیشہ ورانہ انجمنیں کاریگروں نے اپنے حقوق اور پیشے

کے تحفظ کے لئے نہیں بنائی تھیں؛ ان کی تحظیم ریاست نے پیشوں اور مزدوروں کی نگرانی اور ریاست کو ان خود مختار اداروں سے تحفظ فراہم کرنے کے لئے کی تھی۔

یورپی تجربہ سے قطع نظر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خود مختار اداروں کا وجود اسلامی ملکوں میں صنعتوں کی نشوونما کی حوصلہ افزائی کرتا اور اسلامی دنیا کو ترقی میں وہ پیش روی قائم رکھنے کے قابل بناتا، جو اسے چودھویں صدی عیسوی تک حاصل تھی۔ اس عہد میں اسلامی دنیا کی صنعتیں یہ تھیں:

عراق، شام، شمالی افریقہ اور ہسپانیہ میں کاغذ بنانے کی صنعت، کپڑا بننے، کپڑے سینے، قالین اور جوتے بنانے کی صنعتیں جو مختلف مسلم ملکوں میں قائم تھیں۔ ہسپانیہ میں لوہے اور تانبے کی کھلی مشینیں بنانے کی صنعت نہیں تھی؛ اس لئے اسلامی ملکوں کا صنعتی مال مغربی ملکوں کی تیز رفتار صنعتوں سے مقابلہ نہیں کر سکا۔ گو چند قدیم دستکاریوں (مثلاً شیشہ بنانا، دھاتوں پر کام کرنا وغیرہ) نے اپنا اعلیٰ معیار قائم رکھا، لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز میں مشرق و مغرب کے درمیان وہ برابری بالکل ختم ہو گئی جو اس سے پہلے پائی جاتی تھی۔

سیاسی اسباب

1258ء میں منگول غارت گر ہلا کو خان نے بغداد کو برباد کیا، حکمران خلیفہ کولائیں مار کر شہید کیا اور عباسی خلافت کو ختم کر دیا۔ اس عہد کے مورخوں کا کہنا ہے کہ سڑکوں پر آٹھ لاکھ لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ نہری نظام تباہ کر دیا گیا اور قحط کے حالات پیدا ہو گئے۔ وہ شہر جو کبھی اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا، ناپید ہو گیا۔ لیکن یہ بات غور و فکر کے قابل ہے کہ منگول حملہ کی تباہی اس وقت نازل ہوئی جبکہ اسلامی تہذیب انحطاط کی سرحد میں پہلے ہی داخل ہو چکی تھی۔ دنیاوی شعبہ جات میں سلطان با اختیار تھے اور خلیفہ کا حکم نہیں چلتا تھا۔ خلافت کی عمارت پہلے ہی گرنے کے قریب تھی، منگول حملہ تو آخری دھکا تھا۔ گو منگول حملوں کی تباہی بہت زیادہ تھی، لیکن ان کا اثر عراق اور کسی قدر شام تک محدود تھا۔ ہسپانیہ اور مغرب (شمالی افریقہ) میں مسلم تہذیب منگول حملوں سے محفوظ رہی۔ علاوہ بریں منگول غارت گردوں نے بھی رفتہ رفتہ اسلام قبول کرنا شروع کر دیا اور اب ان کے تحت ثقافتی و اقتصادی ترقی ہونے لگی۔ اس لئے معاشی، سیاسی اور علمی ارتقا کی رکاوٹ کا قصور صرف خارجی سیاسی عناصر پر عائد نہیں

تفسیر، تشریح اور توضیح کی زیادہ آزادی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے ایسا کوئی مرکزی سیاسی و مذہبی مقتدرہ نہیں پیدا ہوا جو تنازعات کی صورت میں منصف یا ثالث کے فرائض انجام دیتا۔ کوئی فرد عاصب مملکت کے اقدار و طاقت کو حاصل کر کے مذہبی امامت کا بھی دعویدار ہو جاتا تھا اور اقتدار یا علاقائی ملکیت کے دنیاوی تنازعات کے لئے جنگ کو بھی 'جہاد' یا مقدس جدل قرار دیتا تھا یا پھر اقلیت یا حکمران سے مختلف مذہبی عقائد رکھنے والوں کو دبانے کے لئے عوام کے مذہبی تعصب کو ابھارتا تھا۔ مرکزی مذہبی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے نئی مذہبی فرقے بھی بہت تیزی سے پیدا ہوئے۔ اسلام میں فرد کو مذہبی ملاؤں کی مدد کے بغیر ایمان کی تفسیر کا حق حاصل تھا اور یہ ایک برتر اخلاقی بات تھی لیکن بد قسمتی سے اس وجہ سے تنظیمی کمزوری بھی پیدا ہوئی جو بالآخر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے ہی نہیں، بلکہ سیاسی اور اقتصادی استحکام کے لئے بھی مہلک ثابت ہوئی۔

باب بارہ

مستقبل کے لئے کچھ معروضات

مسلم معاشرہ مغرب کی فوجی قوت سے دب جانے کے بعد انحطاط کا شکار ہو گیا۔ جہاں اس پر اندرونی طور پر رجعت پسندی نے غلبہ پا لیا۔ وہاں ساتھ ہی سخت اختلافات اور مخالفت نے انتشار بھی پیدا کیا۔ اسی طرح ایک طرف تو تاریخ کے فیصلہ کردہ نصیب سے مایوسی ہوئی اور دوسری طرف ماضی سے لگاؤ بڑھنے لگا۔ ایسے حالات میں اگر سائنس اور انسانی احترام بحال کرنا مقصود ہو تو اس معاشرے کو سیاسی، سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی سخت ضرورت پڑے گی۔

سارے کرہ ارض پر اسلامی تحریکیں نمودار ہو چکی ہیں۔ اس طرح کی اصلاحات کی ضرورت سخت غصے اور بے چینی کا اظہار ہیں جو اسلامی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں۔ اس ابھار کے مختلف محرکات ہیں۔ ایسی تحریکوں کی ایک شکل (جیسے کہ فلسطین اور کشمیر کی ہے) معاشرتی اور سیاسی نا انصافی کے خلاف احتجاج کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری قسم (جس کی مثال امام خمینی کے ایران کی ہے) ثابت کرتی ہے کہ اسلام بھی انقلابی پلیٹ فارم پر لوگوں کو متحرک کر سکتا ہے اور یہ تحریک سیکولر طبقے کی زیادتیوں کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ تیسرے درجے پر پاکستان میں جماعت اسلامی اور مصر کی اخوان المسلمین جیسی تحریکیں ہیں جس کا منبج پھیلتے ہوئے درمیانی

طبقے کا وہ حصہ ہے جو سیاسی طاقت حاصل کرنے کا خواہاں ہے لیکن جاگیردارانہ اور سرپرستانہ نظام کے اندر وہ کوئی جگہ نہیں بنا سکا۔ اور آخری قسم اس بین الاقوامی تحریک کی ہے جس کی بنیاد مغربی ملکوں میں مسلمان آبادکار ہیں اور جو بنیادی طور پر ان ممالک کے ثقافتی و سماجی ماحول کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس طرح کے احیاء دین کے سربراہ اور رہنما مغرب کو اسلامی دنیا کی زبوں حالی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کے خیال میں تمام خرابیوں کا سرچشمہ مغربی فکر و ثقافت ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی دنیا کی پسماندگی مغربی قوتوں کے گٹھ جوڑ اور سازش کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ان کے بقول حالات کی اصلاح کے لئے اسلامی راہ اختیار کرنا ضروری ہے اور مغربیت سے ماخوذ ہر چیز کو رد کرنا چاہیے۔ اس میں سائنس، ٹیکنالوجی، جمہوریت اور فکر سب شامل ہیں۔ اس نقطہ نظر کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ احیاء دین کی اہمیت انقلاب فرانس سے زیادہ ہے۔

اگرچہ مغرب کی بالادستی اور تسلط کے خلاف جدوجہد قابل تحسین ہے لیکن اسلامی تحریکوں میں جو روش اور سوچ پائی جاتی ہے، کچھ تشویش ناک بھی ہے کیونکہ ان تحریکوں کی رہنمائی ایسے افراد کے ہاتھوں میں رہی ہے جن کی سوچ محدود اور دقیانوسی ہے۔ چنانچہ بیشتر اسلامی ملکوں میں ان تحریکوں پر بنیاد پرستوں کا غلبہ ہے اور جدیدیت پسند مسلمان یعنی وہ لوگ جو سائنس اور عقلیت کو اسلام کے منافی نہیں سمجھتے تھے وقت کے ساتھ ساتھ پسپا ہو گئے۔ لہذا یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پچاس سال سے پہلے کے مقابلے میں بہت سے اسلامی ملکوں میں سیاست، ثقافت اور تعلیم کے شعبوں میں روشن خیالی کی بجائے دقیانوسیت پروان چڑھی ہے اور بنیاد پرستوں کی کوشش ہے کہ وہ معاشرے کی ڈور سنبھال لیں تاکہ وہ اس کے مستقبل کا تعین کر سکیں۔ اگر ان کا نسخہ کامیاب ہو گیا تو اس سے ایسی تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع ہو گا جو مسلمانوں کو ایک اور تاریک دور میں دھکیل دے گا۔ اس کی مثال موجودہ افغانستان کی صورت حال سے دی جاسکتی ہے جہاں مدرسوں میں تربیت پانے والے طالبان نے افغان معاشرے کو صدیوں پیچھے دھکیل دیا ہے۔ نوآبادیاتی نظام کو رد کرنے کے بہانے آج سائنس اور جدید علوم کو پر زور انداز میں مسترد کیا جا رہا ہے۔ آنکھیں بند کر کے ماضی کی طرف لوٹنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ ایسے اقدامات سے مسلمانوں کے خلاف طاقت کا توازن مزید بگڑنے کا احتمال ہے کیونکہ دور حاضر

میں کسی ملک یا قوم کی طاقت کا سرچشمہ اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اور فکر ہوتے ہیں۔ لہذا بنیاد پرستوں کے پروگرام کے بجائے ایک ایسا لائحہ عمل طے کرنے کی ضرورت ہے جو جدید علوم پر مبنی ہو اور اسلامی ممالک کی اپنی ثقافت سے ہم آہنگ ہو۔ اسی پر عمل کرنے سے اسلامی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔

اول

ہمیں اس خیال کو مسترد کرنا پڑے گا کہ سماج کے ہر مسئلے کا کوئی سادہ اور آسان حل ہوتا ہے اور یہ کہ ڈھونڈنے سے یہ حل کہیں نہ کہیں ماضی میں مل جائے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید معاشروں کے مسائل نہایت پیچیدہ ہوتے ہیں اور ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں جن سے ماضی میں کبھی نہیں نپٹنا پڑا۔ مثال کے طور پر

1- صنعت کاری سے روزگار کے مواقع اور ذرائع پیدا ہوتے ہیں اور ملکی پیداوار بڑھتی ہے لیکن اس سے ہوائی اور دریائی آلودگی پیدا ہوتی ہے جو صحت کے لئے مضر ہے۔ ایسے تضاد کا حل کیا ہے؟

2- مشینوں کے استعمال سے پیداوار بڑھتی ہے لیکن ان کے استعمال سے بہت سے مزدور بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ اس کا منصفانہ حل کیا ہے؟

3- بین الاقوامی بینکوں اور صنعت و حرفت کے اداروں کے لئے ایک نہایت پیچیدہ ضابطہ کار ہے جو ماضی میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

4- کمپیوٹر کے ذریعے بین الاقوامی مواصلات میں ایک انقلاب برپا ہوا ہے جو کرہ ارض کے تمام انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔ اس کے طور طریقے، ضابطے اور اخلاقیات کو متعین کرنے کے لئے ماضی میں کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔

دور حاضر میں معاشرتی مسائل اور ان کے حل دونوں بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں کوئی واحد اور مکمل طور پر تسلی بخش حل تلاش کرنا بے سود ہوگا۔ پسماندہ معاشروں کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان میں صرف سیاہ و سفید کی تمیز ہوتی ہے۔ مثلاً سچ اور جھوٹ۔ صحیح یا غلط۔ اچھا یا برا، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن جدید معاشروں میں مختلف درمیانی راستے بھی ممکن ہوتے ہیں۔ چونکہ جدید معاشروں کے ضابطے اور قوانین مطلق نہیں ہوتے اس لئے تجربات کی روشنی میں

ان میں مناسب تبدیلی لائی جاتی ہے تاکہ ان میں سے خامیاں دور ہوتی رہیں۔ اصلاح ایک دم نہیں کی جاتی بلکہ کئی مراحل پر محیط ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بنیاد پرست یہ خواب دیکھتے ہیں کہ تلوار کے ایک وار سے وہ تمام خرابیوں کو چشم زدن میں ختم کر سکتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس مسائل کے حل کے لئے ایک جامع اور مفصل منصوبہ ہے جو کسی کے پاس نہیں۔ چونکہ ایسے منصوبے ان کے لئے ایمان کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے کسی کو ان کی تبدیلی و تنقید کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس لئے ان کے رویے جاہلانہ اور آمرانہ ہوتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے افراد جو اپنے آپ کو صحیح اور تمام دوسروں کو غلط سمجھتے ہیں بنی نوع انسان کے لئے تباہی و بربادی کا باعث بنتے ہیں اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ ماحول میں فردی تنازعات پر قتل و غارت کی جاتی ہے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ بہتر یہ ہوگا کہ کسی ایک جامع منصوبے کی خواہش رکھنے کے بجائے ہر مسئلے کو سوچ و بچار کر کے اسے جزوی طور پر حل کیا جائے۔ یہ احساس کہ کوئی ہمہ گیر حل موجود نہیں ان معاشروں میں پروان چڑھتا ہے جن میں پختگی اور تدبیر کی خاصیت ہوتی ہے۔ اور یہ تدبیر ان معاشروں کی میراث ہوتی ہے جن میں دانش، مذہبی رواداری اور آزادی فکر کو تحفظ ملتا ہے۔

دوم

جدیدیت اور مغربیت میں تمیز کرنا اشد ضروری ہے اگرچہ ہمارے ہاں دونوں ہم معنی سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ لازم و ملزوم نہیں۔ اسلامی تاریخ و ثقافت میں ہمیں ایسے مفکروں اور دانش وروں کی مثالیں ملتی ہیں جو جدید خیال کے بانی سمجھے جاسکتے ہیں۔ ان میں ابن سینا، ابن رشد اور الرازی شامل ہیں۔ جدیدیت کو تسلیم کرنے کا مطلب قطعاً یہ نہیں کہ روحانیت کو رد کیا جائے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ماضی کے بجائے حال اور مستقبل کو ترجیح دی جائے اور نئے خیالات و تجربات کے لئے گنجائش پیدا کی جائے۔ جدید سوچ کا حامل شخص عقل کی بالادستی کو قبول کرتا ہے اور اسے اعتماد ہوتا ہے کہ منصوبہ بندی اور عمل سے حالات بدلے جاسکتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ایسی رائے رکھ سکتے ہیں جس سے وہ اختلافات رکھتا ہے اور وہ فرد کے حقوق اور خصوصیات کی حیثیت مانتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر سبب کا مسبب ہے اور یہ کہ سائنسی طریق کار پر عمل کر کے ہر مظہر کی وجہ معلوم کی جاسکتی ہے۔ ایک جدید معاشرہ ایسے افراد سے

ہی بنتا ہے۔ اسی صورت میں تشدد کے بغیر مسائل حل ہو سکتے ہیں اور گونا گوں معاشرتی سہولتوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

جدیدیت ہمارے لئے ایک منزل ہونی چاہیے۔ یہ محض مغربیت نہیں بلکہ انسان کی عقل و دانش کی ترقی کا مظہر ہے۔ عوام الناس میں جدیدیت کو بڑھانے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان میں مغرب میں تیار ہونے والی اشیاء کی خواہش پیدا کی جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوکا کولا پینے، نئے فیشن اپنانے، ٹیلی ویژن خریدنے اور جہازوں میں سفر کرنے سے کوئی شخص جدید ہو جائے بلکہ یہ ہوا ہے کہ جدید ساز و سامان کی بھرمار سے کئی معاشروں کے تشخص کو نقصان پہنچا ہے اور وسائل ضائع ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر مغرب میں نومولود بچوں کو بوتل سے دودھ پلایا جاتا ہے اور اس کو جدید سمجھتے ہوئے دوسرے معاشروں کے لوگ اس کی اندھی تقلید کرنے لگے۔ لیکن یہ ایک نامناسب اقدام تھا کیونکہ یہ دودھ مہنگا ہونے کے ساتھ ساتھ ماں کے دودھ کا نعم البدل نہیں بن سکتا تھا۔ چنانچہ اسے مغربی تو کہا جاسکتا تھا لیکن جدید نہیں۔

جدیدیت اور سائنس کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور سائنس خرد مندی کا نہایت نفیس مظہر ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ نوآبادیاتی ملکوں میں عوام نے سائنس کو اس سے پیدا کردہ اشیاء سے جانا تھا۔ نہ کہ ایک طرز فکر کے طور پر۔ یہ بات آج بھی صحیح ہے کیونکہ ہم آج مغرب کے تاجرانہ جال میں پھنسے ہوئے ہیں اور پاکستان جیسے ملکوں میں سائنس کو جدید ہتھیار، جہاز، ٹیلی ویژن، کاروں اور دواؤں کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ ملک کا بالائی طبقہ بھی سائنس کی اصلیت سے واقف نہیں اور نہیں جانتا کہ جدید ساز و سامان کی پیداوار کے پس پردہ کیا سائنسی اصول کارفرما ہیں۔ چنانچہ وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ملک میں سائنسی تعلیم کا خاطر خواہ نظام بنایا جائے۔ نتیجتاً ایسے ملکوں میں تعلیم کے لئے بہت کم رقم مختص کی جاتی ہے اور اس کے نصاب پر موزوں توجہ نہیں دی جاتی۔ ایک جدید معاشرے میں تعلیم کا مقصد واضح طور پر ایسے اشخاص پیدا کرنا ہوتا ہے جو تنقیدی سوچ رکھتے ہیں اور عقل کی قوت کے قائل ہوتے ہیں۔

سوئم

اگرچہ سائنس کے استعمال پر بحث و مباحثہ کی بہت ضرورت ہے اور سائنس کا مصرف صرف

انسان کی بہتری کے لئے ہونا چاہیے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم سائنسی طریقہ کار کو قبول کر لیں اور بے جا اعتراضات سے گریز کریں۔ بہت سے عظیم سائنسدانوں اور روشن خیال مذہبی راہنماؤں نے یہ اقرار کیا ہے کہ سچے مذہب اور سائنس میں کوئی ٹکراؤ نہیں اور دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ انسان کی روحانیت یعنی اس میں تئیر اور خود بینی کی صلاحیتیں نہایت نفیس اور اعلیٰ و ارفع خوبیاں ہیں اور ان کی ترویج ہونی چاہیے۔ دوسری طرف سائنس ہمارے اخلاقی اقدار کو بہتر بنا سکتی ہے کیونکہ اس کا اصرار یہ ہے کہ ہر موقع اور ہر نہج پر سچ تلاش کیا جائے۔ جوں جوں ہمارے سائنسی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ کائنات کی پراسرار اور پیچیدہ حقیقتوں کا احساس اور شدت سے ہوتا ہے۔

چنانچہ عالم و فاضل دانشوروں اور سائنس دانوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ سائنس اور مذہب میں تصادم ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اس کی ایک شرط ہے، یعنی لازم ہے کہ مادی اور روحانی دنیاؤں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جائے۔ بظاہر تو یہ بات اسلامی تعلیمات کے منافی نظر آتی ہے لیکن مسلمان جدت پسند مفکروں نے ٹھوس دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اسلام ان دونوں کو الگ الگ رکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خان کی زندگی کا یہ مشن تھا کہ اس فرق کو واضح کیا جائے اور مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کو اس سے روشناس کیا جائے۔ ان کے علاوہ کئی دانشوروں نے علم کے اصل معنی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ایک عرب عالم نے اس کے 316 مختلف معانی نکالے اور یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن شریف میں بنیادی طور پر روحانی اور مادی علوم میں فرق کیا گیا ہے۔

سائنس اور مذہب کے دائروں کو الگ کرنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ سائنس دراصل عقل اور منطق پر مبنی ہے اور اس کا مقصد مادی دنیا کو سمجھنا ہے۔ دوسری طرف مذہب اور روحانیت کا مقصد ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا ہے جو مادی دنیا سے باہر ہیں۔ مثلاً ”کائنات کیوں وجود میں آئی؟“ یا ”زندگی کا مقصد کیا ہے؟“ وغیرہ۔ جدید سائنس کسی بھی مذہب، روحانی سوچ یا طہرانہ فکر کے ساتھ ساتھ چل سکتی ہے یعنی اس کی تفہیم کئی طریقوں سے ممکن ہے۔ تضاد کا امکان اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی عالم دین قدرتی مظاہر کی توجیہ اس طرح کرتا ہے جو سائنسی

اعتبار سے غلط ہوتی ہے۔ یہ بھی مان لینا چاہیے کہ اگر کسی مذہب میں وقت کے ساتھ تبدیلی آتی ہے تو اس کا فلسفہ باطل نہیں ہو جاتا۔ جیسا کہ تاریخ میں دیکھا گیا ہے۔ سائنسی نظریات میں تبدیلی کے باوجود سائنس کی بنیادی سچائی قائم رہتی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ مذہبی سوچ میں تبدیلی کو اس مذہب کی شکست کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ دراصل سائنس اور مذہب میں تبدیلی و تغیر ناگزیر ہے بلکہ یہ انسان کی ترقی کا تقاضا ہے۔

معاشرتی ترقی اور خرد افروزی دونوں کے لئے سائنس کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ واضح رہے کہ سائنس مذہب کا نعم البدل نہیں اور اخلاقیات کے معاملات کے بارے میں یہ بالکل خاموش ہے نہ اس کا عدل و انصاف، خوبصورتی اور احساس جمال سے کوئی تعلق ہے۔ ایک خاص مشینی کلچر میں نفیس جذبات کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی تباہ کن اسلحوں کی پیداوار اور دوڑ کو روکا جاسکتا ہے، ایسے معاشرے میں معاشرتی و سماجی ناہمواری یا روز افزوں ماحولیاتی آلودگی پر کوئی بندش نہیں۔ چنانچہ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ بنی نوع انسان کے تمام مسائل کا حل سائنس میں مضمر ہے۔ یہ بجا ہے کہ مغربی دنیا میں سائنس کو ہی تمام مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے اور اس نے ایک عقیدے کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اگرچہ یہ سوچ غلط ہے لیکن اس کے خلاف جدوجہد مغرب ہی میں ہونی چاہیے۔ نہ کہ ہمارے جیسے ملکوں میں جہاں سائنس کا پودا ہنوز پنپ نہیں سکا۔

چہارم

یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ قدرت کا کوئی قانون نہیں کہتا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی صرف مغرب ہی میں ممکن ہے۔ سائنس دراصل آفاقی اور عالمی ہے اور سائنسی علوم کے حصول پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مختلف ممالک میں فرق ابدی ہے۔ مناسب اور موزوں کوششوں سے یہ فرق ختم کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ تسلط کے نظام کو ختم کیا جائے۔ نہ صرف یہ کہ ایک ملک کا دوسرے پر غلبہ ختم ہو بلکہ ایک ہی معاشرے میں کوئی طبقہ دوسرے طبقات کو دبا نہ سکے۔ ترقی پذیر ملکوں میں اکثر اوقات یہ دیکھا جاتا ہے کہ افسر شاہی اور عسکری ادارے جدید اور سائنسی اصولوں پر منظم ہیں لیکن عوام الناس ابھی تک دقیانوسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ جدید معاشرے کی طرف سفر شروع کرنے کے لئے ضروری

باب تیرہ
ضمیمہ نمبر 1

اسلامی سائنس کیا ہے؟

(یہ باب اس اضافہ شدہ مضمون پر مشتمل ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے ماہنامے ”ہیرلڈ“ کے جنوری 1988ء کے شمارے میں چھپا تھا اور ان کی اجازت سے اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

پاکستان میں حالیہ چند برسوں کے دوران کٹر مذہبیت کا ایک نیا اور عجیب مظاہرہ دیکھنے میں آیا ہے۔ اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اسلام کے دائرہ کار کو عمرانیات سے آگے بڑھا کر مظاہرہ قدرت تک وسیع کیا جائے۔ وہ اسے اسلامی سائنس کہتے ہیں۔

یہ نئی سائنس صدیوں پہلے گزرے ہوئے زمانہ اوسط کی خاک سے ابوالہول کی طرح یکا یک ابھری ہے۔ اس سائنس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ ہر معلوم سائنسی حقیقت اور مظہر قدرت کا پیشگی ادراک چودہ سو سال پہلے کیا گیا تھا، نیز یہ کہ تمام سائنسی پیش گوئیاں درحقیقت کتاب مقدس کے مطالعہ پر مبنی ہیں۔ اس طرح ایک بار پھر زمانہ اوسط کی طرح مذہبیت کی تاج پوشی سائنسوں کی ملکہ کے طور پر کی جا رہی ہے۔

سائنس کے اس نقطہ نظر کو ریاست کی فیاضانہ سرپرستی، اہم شخصیتوں کی حمایت اور مختلف افراد

اور جماعتوں کے بے حد و حساب عطیات حاصل ہیں۔ اس کے نتیجے میں ایک ایسی چیز پیش کی جا رہی ہے جسے جدید سائنس کے چیلنج کا جواب سمجھا جا رہا ہے۔ اسلامی سائنس کے داعی یہ کہتے ہیں کہ اس پاک سرزمین میں معمولی دنیاوی سائنس کا کوئی کام نہیں ہے۔ ملحدانہ دنیاوی تہذیبوں کے پیدا کردہ نظام سرمایہ داری یا سوشلزم یا جمہوریت کے ساتھ جدید سائنس کو بھی ملک بدر کر کے اس کے اصل وطن یعنی مغرب کو ارسال کر دینا چاہیے۔

سائنسی معجزات کی کانفرنس

حال ہی میں مجھے نئی ”اسلامی سائنس“ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ”قرآن و سنت کے سائنسی معجزات کی کانفرنس“ کے انعقاد کی وجہ سے میسر آیا۔ اس کانفرنس کا افتتاح جنرل ضیاء الحق نے 18 اکتوبر 1987ء کو اسلام آباد میں کیا تھا۔ یہ بڑی کانفرنس اسلام آباد کی عالمی اسلامی یونیورسٹی نے مکہ کی ”تنظیم معجزات اسلامی“ کے تعاون سے منعقد کی تھی۔ انتظامات کی شان و شوکت پر نکتہ چینی محال تھی لیکن خوش قسمتی سے اس کا مالی بوجھ پاکستان پر کم ہی پڑا، کل خرچ چھیاٹھ لاکھ روپے (چار سو ہزار ڈالر) آیا، جس کا نصف سعودی عرب کی حکومت نے برداشت کیا۔ سعودی حکومت اکثر اس قسم کے کاموں کے لئے رقوم فراہم کرتی ہے۔ یہ کانفرنس کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھی کیونکہ چند ماہ پہلے اس قسم کی کانفرنس کراچی میں ہو چکی تھی اور اس سے بھی پہلے چند ایسی ہی کانفرنسیں منعقد ہو چکی تھیں۔

سائنسی معجزات کی کانفرنس سے مجھے ان مسائل و مشکلات کی جھلک دیکھنے کا موقع ملا جو جدید ”اسلامی سائنس“ کو درپیش ہیں۔ بہتر ہے کہ قاری خود ان کانفرنسوں میں پڑھے گئے۔ علمی مقالات کا مطالعہ کرے۔ تاہم مقالات کے صرف عنوانات پڑھ کر ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سائنسی معجزات کی اس کانفرنس کی نوعیت کیا تھی

1- قرآن شریف کی سورۃ النحل کی آیت 66 کے حوالے سے دودھ کی کیمیائی ساخت۔

2- قرآن میں بلند آسمان پر انسان کی کیفیت کا بیان۔

3- قرآن میں بارشی بادلوں کا بیان۔

4- کیا تم نے آگ کا مشاہدہ کیا ہے؟

5- قرآن شریف میں کچھ بحرّی جغرافیہ کے جدید مظاہر کا الہامی انکشاف۔

اس قبیل کے دیگر 65 مقالات پارسا و پرہیزگار شرکانے پیش کئے۔ ہر مقالہ پر باقاعدہ پڑھے جانے کے بعد سنجیدہ مباحثے بھی ہوئے۔ محض ایک مبصر کی حیثیت سے بھی میں نے خود کو اجنبی محسوس کیا کیونکہ بعض اجلاسوں کے عنوانات تک میری فہم سے بالا تھے۔ مثلاً ایک عنوان تھا ”ان چیزوں پر گروہی مباحثہ جن کا علم صرف اللہ کو ہے“۔ یہ مباحثہ مغرب کی نماز کے بعد کسی وقت ہونا تھا۔ میں نہیں سن سکا۔ تاہم میں اکثر تعجب سے سوچتا ہوں کہ وہ کیا راز تھے جن کے راز داں بحث کرنے والے گروہ کے ارکان تھے۔

”اسلامی سائنس“ کے عجیب و غریب نتائج

کہا جاتا ہے کہ جدید سائنس کے کارناموں کو سمجھنا مشکل ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن نئی ”اسلامی سائنس“ کے کارناموں کو سمجھنا مشکل تر ہے۔ تاہم میں قاری سے درخواست کروں گا کہ وہ مختلف اسلامی سائنس کی کانفرنسوں میں پیش کردہ بعض نمایاں نتائج پر غور کر کے اپنی رائے خود قائم کرے۔ البتہ ایک انتخاب مندرجہ ذیل ہے:

مصر کی مشہور الازہر یونیورسٹی میں ارضیاتی علوم کے استاد ڈاکٹر محمد مطلب نے قرآنی آیات سے ارضیاتی حقائق و مظاہر کے تعلق پر ایک انتہائی فاضلانہ مقالہ سائنسی معجزات کی کانفرنس میں پیش کیا۔

یہ مقالہ معمولی قسم کے سائنس داں کے لئے سمجھنا مشکل تھا اور سچ بات تو یہ ہے کہ یہ اب تک میری گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ فاضل ڈاکٹر نے کہا کہ پہاڑوں کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں اور اللہ نے انہیں ان میخوں کی طرح بنایا ہے جو خیمے کو زمین سے جڑا ہوا رکھتی ہیں اور آندھی سے اڑنے نہیں دیتیں۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ اگر پہاڑ نہ ہوں تو زمین کے گھومنے سے ہر چیز ادھر ادھر اڑنے لگے اور قیامت برپا ہو جائے۔ گویا پہاڑوں کے بغیر زمین کا وجود ناممکن ہے۔

تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ نتیجہ ذرا عجیب و غریب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو اس مظہر قدرت کا علم نہیں ہے جسے نیوٹن کشش ثقل کہتا تھا۔ علم طبیعیات جس کا ہم سب کو تھوڑا بہت علم ہے، یہ بتاتا ہے کہ زمین کے اندر مرکزی کشش ثقل مرکز گریز قوت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم میں سے ہر ایک فضا میں پھینکا جا چکا ہوتا، بلکہ ہر شخص خلا میں بجائے خود خلائی

جہاز ہوتا۔ اس لئے معمول کے اصول طبیعیات کے مطابق اگر تمام پہاڑوں کو کاٹ کر ساری زمین ہموار کر دی جائے تو بھی زمین منتشر نہیں ہوگی۔ بہر حال یقیناً کوئی بھی یہ نہیں چاہے گا کہ کیونکہ پہاڑوں کو ختم کرنا ایک ماحولیاتی المیہ ہوگا۔ لیکن بات یہ ہے کہ پہاڑوں کو خیمے کی میخیں کہنا ایک استعارہ تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر کائنات ڈاکٹر مطلب کی غیر معمولی طبیعیات کے مطابق چلتی ہے اور معمولی طبیعیات سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے تو فاضل ڈاکٹر کے نظریے پر میں نے جو اعتراض کیا ہے وہ بے بنیاد ہے۔

ایک اور مقالہ میں ایک نظریاتی اہمیت کے مسئلہ کو اس طریقے سے پیش کیا گیا جو بہت ہی غیر معمولی تھا۔ مصر کے انجینئر عبدالفتح نے یہ مقالہ پیش کیا۔ انہوں نے 1976ء میں مصری فوج میں خدمات کے دوران ٹینک شکن گولہ بارود کے متعلق اپنے تجربہ کی بنیاد پر یہ خوفناک شہادت پیش کی کہ اللہ تعالیٰ تانبے کے خالی خولوں کو ایسے انسانوں اور جنوں کو تباہ کرنے کے لئے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہے جو خلائی جہازوں میں بیٹھ کر آسمانوں کے ممنوعہ علاقوں میں جانے کی جرأت کریں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خالی خول ہی کیوں بھرے ہوئے خول کیوں نہیں؟ پارسا انجینئر کی دلیل یہ ہے کہ خالی تلوں میں ٹھوس تلوں کی بہ نسبت تباہ کن صدماتی لہر زیادہ شدت کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ حکمت مقدس ہر لحاظ سے مکمل ہے، اس لئے وہ خلائی پرتابوں (میزائل) کی تباہی کے لئے موزوں مادہ منتخب کرے گی، اس لئے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تانبے کے خالی خول ہی منتخب کرے گا۔

ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ٹھیک ہو، لیکن اگر برائی پر معمول نہ کیا جائے تو ایک چھوٹی سی بات عرض کی جائے۔ وہ یہ کہ وہ لوگ جو اسلحہ کی تجارت کا علم رکھتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ تانبے کے خول رفتہ رفتہ بیکار ہوتے جا رہے ہیں اور اسلحہ کی صنعت آج کل ایک نئی دھات استعمال کر رہی ہے کیونکہ یہ زیادہ دھماکہ خیز ہوتی ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا بہشتی پرتابے (Missiles) پرانی طرز کے تانبے کے خول کے بنے ہوں گے یا اس نئی دھات کے۔ یہ یقیناً ایک مشکل سوال ہے۔

منافقت ہمارے معاشرے کا ایک عام مسئلہ ہے۔ اس بات کو اکثریت مانتی ہے لیکن ایسے ذہین یا بہادر لوگ بہت کم ہوں گے جو منافقت کو ناپنے کے لئے ریاضی کے قاعدے استعمال

کرنے کی جسارت کر سکتے ہوں۔ لیکن پاکستان ایسوسی ایشن آف سائنٹسٹس اور سائنٹیفک پروفیشن کے زیر اہتمام جون 1986ء میں قرآن اور سائنس پر منعقدہ بین الاقوامی سیمینار میں ایک دلیر سائنس دان نے منافقت کے بارے میں ایک نظریہ پیش کیا۔ پاکستان کونسل فار سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ایک سینئر سائنس دان، ڈاکٹر ارشد علی بیگ نے ریاضی کا ایک فارمولا پیش کیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس فارمولے کے ذریعہ کسی معاشرے میں منافقت کے درجہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اس اسلامی سائنس دان کا یہ فارمولا اس مفروضے پر مبنی ہے کہ ہر چیز کی میٹریکل ردعمل کے ذریعہ واقع ہوتی ہے۔ مثلاً

کفار + تعلیمات پیغمبر —> مذہبی معاشرہ

تفصیلات سے صرف نظر کر کے (کیونکہ تفصیلات سے تو قاری مقالہ پڑھ کر واقف ہو سکتا ہے) میں مصنف کے اخذ کردہ نتائج بیان کروں گا۔ فاضل مصنف کے حساب سے مغربی معاشرے میں منافقت کی قدر 22 ہے جبکہ ہسپانیہ اور پرتگال میں 14 ہے۔ یہ ایک پراسرار بات ہے کہ پاکستانی معاشرے کے لئے منافقت کی کوئی قدر متعین نہیں کی گئی حالانکہ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے معاشرے کی باگ ڈور ہی منافقوں کے ہاتھ میں ہے۔ بایں ہمہ قاری یقیناً ڈاکٹر بیگ کی جدت کو سراہے گا اور ان کی چھوٹی موٹی غلطیاں معاف کر دے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”اسلامی سائنس“ کے حالیہ معتقدوں میں پاکستان کی خلائی تنظیم "Suparco" (جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ NASA کے مماثل ہے) کے چیئر مین بھی شامل ہیں۔ کراچی میں منعقدہ قرآن اور سائنس کانفرنس میں پڑھے گئے ایک مقالے میں جناب سلیم محمود نے یہ تجویز پیش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کی تشریح آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت میں تلاش کی جائے۔

جیسا کہ ہر صاحب ایمان مسلمان جانتا ہے، معراج میں تقریباً کوئی وقت صرف نہیں ہوا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آئے تو ان کے دروازے کی زنجیر ہنوز ہل رہی تھی۔ اس بظاہر کم وقفہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ اضافیت کی توسیع وقت کی ایک مثال ہے، حال میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے اس موضوع پر ایک فلم بھی بنائی ہے۔ توسیع وقت کے مظہر کو طبیعیات کے ماہر بخوبی جانتے ہیں: چلتی ہوئی گھڑیوں کی رفتار

آہستہ معلوم ہوتی ہے۔

بد قسمتی سے اس وضاحت میں ایک چھوٹا سا مسئلہ حائل ہے۔ نظریہ اضافیت درحقیقت اس کے بالکل برعکس ہے جو چیئر مین صاحب سمجھتے ہیں۔ افسوس کہ اضافیت پر ہر نصابی کتاب واضح طور پر یہ کہتی ہے کہ ایک جگہ ساکن رہنے والے شخص کے لئے زیادہ وقت لگے گا بہ نسبت اس شخص کے جو تیز رفتاری سے لمبے سفر پر جا کر واپس آئے گا۔ کاش کہ چیئر مین صاحب نے اضافیت کو مذہبی اسرار و رموز سلجھانے کی کنجی کے طور پر استعمال کی تجویز پیش کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ کرنے میں کچھ وقت صرف کیا ہوتا۔ اگر ہم روحانی تحقیقات کے بجائے خلائی سائنس کے مادی پہلو پر زیادہ توجہ دیں تو ہمارے چھوٹے سے خلائی پروگرام کے حق میں بہتر ہوگا۔

اسلام آباد سے شائع ہونے والا سہ ماہی رسالہ “

"Science and Technology in the Islamic World" (اسلامی دنیا میں سائنس

اور ٹیکنالوجی) جدید اسلامی سائنس کا اہم وکیل اور مبلغ ہے۔ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ میں پاکستان میں سائنس کے شعبہ کی افسر شاہی کے بڑے بڑے نام ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں کے ذریعہ پاکستان میں سائنس کا مستقبل طے کرتے ہیں؛ سائنسی منصوبوں کے لئے رقوم دیتے ہیں اور نئے ادارے قائم کرتے ہیں۔ نمونے کے طور پر ان چند مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں جو اس رسالے نے حالیہ شماروں میں شائع کئے ہیں:

1- چند قرآنی آیات جن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے ہیں۔

2- کائنات کی متناسب اور موزوں پیکری اور زمین کی تخلیق کا قرآنی اصول۔

3- چند احادیث جن میں جہاد کے حوالے ہیں۔

4- دو مقبول پاکستانی بینکوں کے طغریے اور ان کی معنویت۔

5- انس و جن کی دو فرعیات (Dichotomy) اور ان کی تقدیر۔

ظاہر ہے اس بہت عالمانہ رسالے کو مادی سائنس اور ٹیکنالوجی سے بہت کم واسطہ ہے۔ لیکن یہ رسالہ رواجی سائنس کے شعبے میں جو کچھ کھوتا ہے اس کی تلافی خالص جدت سے کر لیتا ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا مضامین میں سے مضمون نمبر 5 کو لیجئے۔ اس مضمون کے مصنف ڈاکٹر صفدر جنگ راجپوت ہیں جو ڈیفنس سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے سینئر سائنس دان ہیں۔

جیسا کہ ہر قاری یقیناً جانتا ہے اللہ تعالیٰ نے جن کو آگ سے اور انسان کو خاک سے (بعض کے بقول کالی کیچڑ سے) بنایا۔ ڈاکٹر راجپوت کے نزدیک یہ آتش مخلوق زندہ حقیقت ہے جس سے وہ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ جنات ان کی تحقیق کا موضوع ہیں۔ جناتیات پر ان کے مذکورہ بالا مضمون کی تلخیص حسب ذیل ہیں:

(ا) گمان اغلب ہے کہ جنات کا تخلیقی منبع میتھن گیس بمعہ دیگر سیر شدہ جاذب ہائیڈرو کاربن ہے کیونکہ ان کو جلانے سے دھوئیں کے بغیر شعلہ نکلتا ہے۔ یہ نتیجہ ان معلوم حقائق پر مبنی ہے کہ اللہ نے جن کو آگ سے بنایا اور کبھی بھی ایسا جن نہیں دیکھا گیا جس سے دھواں نکل رہا ہو۔
(ب) حوران جنت کا حسن اور پاکیزگی معلوم حقائق ہیں۔ ان میں اس حقیقت کا اضافہ بھی کر دیجئے کہ حوروں کو استعمال کے لئے پیدا کیا گیا کیونکہ ان کو استعمال کرنے والے انسان یا جنات ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن و انس دونوں مشابہ اور اہم اصل ہیں۔
(پس ثابت ہو گیا)۔

(ج) کافی بحث و تمحیص کے بعد جنات کی ماہیت کے بارے میں آخری نتیجہ یہ نکلا: ”میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جنات سفید نسلیں ہیں“۔

اعلیٰ رتبہ رکھنے والے پاکستانی سائنس دانوں میں صرف ڈاکٹر راجپوت ہی جنات کو انتہائی اہمیت نہیں دیتے۔ پاکستان ایٹم انرجی کمیشن کے ایک سینئر ڈائریکٹر جناب بشیر الدین محمود نے 1990ء میں یہ سفارش کی کہ آگ سے بنے ہوئے جنات کو توانائی کے منبع یا وسیلہ کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کے مسئلہ توانائی کا آخری حل تلاش کر لیا گیا ہے۔

گو یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسلام آباد میں منعقدہ 1983ء کی اسلامی کانفرنس میں ایک جرمن مندوب نے دعویٰ کیا کہ اس نے حسابی مقامیات کے ذریعہ ”خدا کے زاویے“ کا حساب لگا لیا ہے اس کے مطابق یہ زاویہ $\frac{\pi}{N}$ ہے جہاں $\pi = 3.1415927$ ۔۔۔۔۔ اور N کیا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔ (اس کتاب کے قاری کو اشتباہ کا پورا حق ہے)۔ کیا کوئی بھی شخص ایسی غیر مرئی چیز کو ناپنے کا خیال بھی ذہن میں لاسکتا ہے؟ شکوک رفع کرنے کے لئے میں قاری کو مشورہ دوں گا کہ وہ پاکستان کی سائنس و

ٹیکنالوجی کی وزارت کا 1983ء میں شائع کردہ کتابچہ بعنوان "Islamic Science Conference" صفحہ 82 دیکھ لے۔ یہ صفحہ پڑھتے ہی قاری کو اپنی ہی نظر پر دھوکہ ہونے لگے گا۔ قاری اس کی بھی تصدیق کر سکتا ہے کہ حکومت پاکستان نے اس پاگل سائنس دان کی مہمان داری کی تھی اور اس کے تمام مصارف برداشت کئے تھے۔ سوال اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس گستاخی کو کسی نے چیلنج کیوں نہیں کیا؟ شاید اس کے دو اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ اس کی بکواس (کم از کم وہ بکواس جو شائع ہوئی ہے) اتنی بے ربط ہے کہ شاید کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور دوسرے وہ اکیلا ہی اس قسم کی لغزش کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا۔

کیا یہ سائنس ہے؟

اس قسم کے مقالات اور مضامین کو ایک ایسا شخص جس نے مذہبی کٹر پن کے ماحول سے باہر رہ کر تعلیم حاصل کی ہے، مجذوب کی بڑ سمجھے گا۔ وہ یہ بھی شبہ کر سکتا ہے کہ یہ شاید خلل دماغ کی کوئی قسم ہے اور ازراہ ہمدردی وہ یہ مشورہ بھی دے سکتا ہے کہ مذکورہ بالا قبیل کے سائنس دانوں کے علاج کے لئے کسی ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کی جائیں۔ دیگر نقاد طیش میں آ کر اس نام نہاد "اسلامی سائنس" کو سائنس ماننے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تنقید غیر منصفانہ ہو۔ سائنس ایک قسم کے لوگوں کے لئے ایک معنی اور دوسرے قسم کے لوگوں کے لئے بالکل مختلف دوسرے معنی رکھ سکتی ہے۔ معانی کے اس ابہام کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے واضح طور پر جدید سائنس کی "تعریف" کا تعین کریں اور پھر یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ عصر حاضر میں "اسلامی سائنس" سے کیا مراد ہے۔

جدید سائنس واضح اور قطعی قاعدوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے ذریعہ مادی کائنات کا عقلی ادراک کیا جاتا ہے۔ سائنس کو قوت و اختیار کلی طور پر اس طریق کار سے حاصل ہوتا ہے جو مشاہدہ و استنباط کا مرکب ہے۔ تمام سائنسی معلومات کی عمارت ہمارے تجربات و حواس کی معروضی بنیاد پر تعمیر کی جاتی ہے۔ یہ معروضیت جس وجہ سے ممکن ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ تجربہ اور منطقی مطابقت ہی صداقت کے معیار ہوتے ہیں۔ اس میدان میں سائنسدان کی داخلی کیفیت یا اخلاقی کردار اس کے سیاسی خیالات یا قومیت یا سائنس کی دنیا میں اس کا رتبہ وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں

ہوتی۔ جہاں تک رتبہ و مقام کا تعلق ہے، یہ مثال پیش کرنا کافی ہے کہ جب آئن سٹائن نے کوانٹم مکینکس پر (غلط) تنقید کی تو کسی نے اس کی باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا، گو کہ وہ اپنے زمانے کا مانا ہوا سب سے بڑا ماہر طبیعیات تھا۔

کوئی اسے پسند کرے یا ناپسند، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید سائنس کی نوعیت کلیتاً دنیاوی ہے۔ سائنسی حقائق کی تصدیق کے لئے کسی مقدس دیوتا یا دیوی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کسی مقدس و مقتدر ہستی کے وجود کا نہ تو اقرار کیا جاتا ہے نہ انکار۔ تاہم انفرادی طور پر بعض سائنس دان بہت مذہبی ہوتے ہیں۔ وہ کائنات کے مقصد اور تنظیم و ترتیب کے قائل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ یاد دلانا کافی ہے کہ جدید سائنس کے بانی، گلیلیو اور نیوٹن دونوں ہی عیسائی کلیسا کے عقائد اور رسوم کے پابند تھے۔ جب سترہویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس کی دریافتوں کا انقلاب آیا تو سائنس اور مذہب کے راستے جدا ہو گئے۔

مذکورہ بالا مسئلہ کی واضح تشریح نئے زمانے کی مندرجہ ذیل مثال سے ہوتی ہے۔ 1979ء میں طبیعیات کا نوبیل انعام عبدالسلام، سٹیون وائن برگ اور شیڈن گلاشو کو دیا گیا۔ انہوں نے وہ بنیادی اصول دریافت کیا جو قدرت کی دو بنیادی طاقتوں، کمزور طاقت اور برقیاتی مقناطیسی طاقت کو متحد کرتا ہے۔ سلام وائن برگ اصول اس صدی کی نہایت اثر آفریں دریافتوں میں سے ایک ہے۔ لیکن ذرا اس کے ایک دریافت کنندہ عبدالسلام کے عقائد پر نظر ڈالیے۔ سلام جا بجا قرآن کے حوالے دیتے ہیں، پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور مذہبی کٹر پن کی وجہ سے کبھی کبھی اپنے بعض سائنسی حامیوں کی مجالت کا باعث بھی بنتے ہیں۔

1974ء میں جب سے ان کے احمدی فرقے کو اسلام سے خارج کیا گیا ہے، انہیں پاکستان میں قانونی طور پر مسلمان نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اس وجہ سے ان کے مذہبی عقائد میں کمزوری آنے کی بجائے پختگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے برعکس وائن برگ نسلی اور پیدائشی اعتبار سے یہودی ہے، لیکن وہ پکا ملحد ہے، جس کے نزدیک کائنات ایک وجودی حقیقت ہے، جو احساس و مقصد سے عاری ہے۔ عقائد کے اعتبار سے ان دونوں سائنس دانوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل ہے۔ اس کے باوجود یہ دونوں اپنے اپنے طور پر اور تقریباً بیک وقت طبیعیات کے ایک ہی اصول یا نظریے کی دریافت میں کامیاب ہوئے۔

اصول تکذیب: سائنس کی کسوٹی

خالص یا سچی سائنس کو غیر سائنسی یا ناسائنسی سے کس طرح علیحدہ کیا جائے؟ دوسرے الفاظ میں وہ کیا ہے جو بیانات یا دعویٰ کے مخصوص مجموعے کو سائنس کہلانے کا حقدار بناتا ہے؟ اس کا جواب سائنس کے انگریز فلسفی سر کارل پوپر کے اصول تکذیب میں موجود ہے۔

”اگر ہم کسی نظریے کو سائنسی تسلیم کرانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ نظریہ ایسی پیش گوئیوں کا حامل ہو جن کی تصدیق مشاہدے اور تجربے کے ذریعہ کی جاسکے۔ اگر نظریہ کوئی قابل تصدیق پیش گوئی نہ کرے تو اسے غلط ثابت کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہوتا۔ ناقابل تکذیب نظریات سائنسی نہیں ہوتے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ناقابل تکذیب نظریہ خراب، غلط یا کچھ اور ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ غلط ثابت کرنے کی کسوٹی نہ ہونے کی وجہ سے یہ غیر سائنسی ہے۔ یقیناً بہت سی اچھی چیزیں۔۔۔۔۔ بلکہ شاید زندگی کی بہترین چیزیں۔۔۔۔۔ غالباً سائنس سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔“

اصول تکذیب کی تشریح مندرجہ ذیل مثال سے ہوتی ہے:

ارسطو کو یقین تھا کہ پتھر اس لئے زمین پر گرتا ہے کہ زمین اس کی ماں ہے اور وہ اپنی ماں کی گود میں گرنا چاہتا ہے۔ اس نظریے کے متعلق دو سوال کئے جاسکتے ہیں: اول، کیا یہ سائنسی نظریہ ہے؟ دوم: ارسطو صحیح تھا یا غلط؟ پہلے سوال کا جواب ہے: ”نہیں“۔ ارسطو کا نظریہ ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ وقت کے ساتھ پتھر کی رفتار کس طرح بڑھتی ہے۔ اور کیا ہلکی یا بھاری چیزوں کے گرنے کی رفتار میں فرق ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، یہ نظریہ بتاتا ہے کہ چیزیں کیوں گرتی ہیں۔ لیکن ایسی کوئی پیش گوئی نہیں کرتا جس کی تصدیق تجربہ کر کے کی جاسکے۔ کیونکہ اسے غلط ثابت کرنے کا کوئی طریقہ نہیں، اس لئے یہ یقیناً سائنسی نظریہ نہیں ہے۔ جہاں تک اس کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال ہے تو اس کا تعجب نیز جواب یہ ہے کہ ”کوئی نہیں جانتا“۔ قاری کو اپنے جواب کی صحت پر یقین ہو سکتا ہے۔ لیکن کیا وہ ثابت کر سکتا ہے کہ پتھر کو ماتر بھومی سے محبت نہیں ہے؟

اسی طرح ہمیں اصول تکذیب کو اسلامی سائنس کے مختلف نظریات پر منطبق کرنا چاہیے۔ ان نظریات میں سے چند کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ ہم چاہیں گے کہ قاری ان نظریات کو بھی اصول تکذیب کی کسوٹی پر پرکھے۔ کچھ مزید نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

نیچے دیئے ہوئے خاکہ نمبر 2 کو دیکھئے۔ اس میں ایک فارمولا دیا ہوا ہے جس کے ذریعہ آپ باجماعت نماز میں کمائے ہوئے ثواب کو ناپ سکتے ہیں۔ اس فارمولے کے مصنف ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ قریشی ہیں جو پاکستان میں سائنسی حلقے کے ممتاز رکن ہیں PCSIR کے سابق چیئر مین۔ قائد اعظم یونیورسٹی میں شعبہ طبیعیات کے سابق چیئر مین اور مختلف بین الاقوامی اداروں میں پاکستان کے نمائندے رہے ہیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب کا فارمولا صحیح ہے؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس سوال کا جواب دینے کے لئے روز محشر کا انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ فارمولا سائنسی نہیں ہے۔ فاضل ڈاکٹر صاحب کے اس فارمولے اور اس کے خاکے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کوئی تجربہ نہیں کیا جاسکتا۔

MashalBooks.org

خاکہ نمبر 2

MashalBooks.org

خاکہ نمبر 3

MashalBooks.org

اصول ریاضی کی جستجو نہیں ہے، اس لئے اس کی جانچ پرکھ کے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں کیا جائے گا اور اس لئے کبھی کسی نئی ترکیب کی اختراع یا مشین کی ایجاد بھی نہیں کی جائے گی۔ اسلامی سائنس جدید سائنس کے خلاف ایک رد عمل ہے۔ یہ سائنس کی کوئی نئی جہت نہیں ہے۔ کوئی ہمیں یہ بتائے کہ اسلامی سائنس کس طرح اسلامی ہے؟ ان دنوں اس سوال پر بحث کرنا کہ ایک چیز بہ نسبت دوسری کے زیادہ اسلامی ہے، خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کٹر پن کے خوفناک دیو کی نیند ہلکی ہے اور اس کے ہاتھ میں ہمیشہ تلوار رہتی ہے۔ اس سوال پر دلائل سنتے ہی وہ آسانی سے جاگ اٹھتا ہے۔ گو علماء کی رضامندی آسان نہیں ہوتی، لیکن یہ خیال پریشانی کا باعث ہے کہ وہ شخص جو منافقت کا ریاضی فارمولا بناتا ہے وہ درحقیقت مذہبی نظریے کو مضحکہ خیز چیز میں تبدیل کرتا ہے۔ اس جرمن پاگل کے کام پر ہم پہلے ہی بحث کر چکے ہیں جس نے 1983ء کی اسلامی کانفرنس میں خدا کا زاویہ ناپا تھا۔ کیا وہ اسلام کی خدمت تھی؟ اور اس اعلیٰ عہدہ رکھنے والے سائنس دان کے بارے میں کیا کہا جائے جس نے جنوں کو بطور ایندھن استعمال کرنے اور اس طرح پاکستان میں توانائی کی کمی کے مسئلے کو حل کرنے کی وکالت کی ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ ”اسلامی سائنس“ لفظ سائنس کے فریب کارانہ استعمال کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ابتدائی دور کے مسلمان سائنس دانوں کے کام کی بنیاد پر اپنی بڑائی جتانے کی کوشش ہے۔ لیکن اس میں ان خصوصیات میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہے، جن کے باعث اسلام کے سنہری دور کی سائنسی کامیابیاں غیر فانی ہیں۔ اگر اس دور کے درخشاں ستارے ابن سینا، عمر خیام، ابن الہشیم اور دیگر سائنس دان، آج زندہ ہوتے تو وہ یہ سب کچھ دیکھ کر انتہائی شرمندہ ہوتے جسے آج اسلامی سائنس کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس دور کے سائنس دان اور دانشور گو کہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے، لیکن ان کی سائنس کلی طور پر دنیاوی تھی۔ وہ پیش پا افتادہ باتیں نہیں کرتے تھے اور نہ ہی منافقت یا ثواب کے ریاضیاتی فارمولے تلاش کرتے تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے اہم طبیعیاتی کلیے دریافت کئے اور نئے تصورات و نظریات تخلیق کئے۔ آج ہم ناصر

الدین طوسی کو اس کے علم مثلث، عمر خیام کو مکتعی مساواتوں کے حل، جابر ابن حیان کو کیمیائی تجربات کے ساز و سامان کی اختراع اور الجزری کو پیچیدہ مشینوں کی وجہ سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی سائنس کا موضوع ”حقیقت“ تھی۔ اسی سبب سے دنیا کی تاریخ میں ان کا مقام محفوظ ہے اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی کٹرپن نے ان کو کبھی معاف نہیں کیا اور آج تک انہیں کافر اور طرد کہا جاتا ہے۔ آج ہم یہ بات تقریباً فراموش کر چکے ہیں کہ مسلم ثقافت کے ان سپوتوں کی جانوں کو کافر عیسائیوں اور وحشی منگولوں سے نہیں بلکہ سائنس دشمن کٹر مسلم علماء سے خطرہ تھا۔

سیاسی جڑیں

اسلامی سائنس کے نام سے جو نیا نظریہ دیکھنے میں آ رہا ہے اس کی تہہ میں کیا چیز ہے؟ وہ کوئی سیاسی قوتیں ہیں جو اس کی آبیاری کر رہی ہیں اور معاشرے کے وہ کون سے طبقے ہیں جن میں یہ سب سے زیادہ مقبول ہے؟ کیا یہ سائنسی مظہر قائم رہے گا یا بلبلے کی طرح پھٹ کر غائب ہو جائے گا؟ یہ سوالات مشکل ہیں اور ان کا جواب دینے کے لئے کافی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ ایک تفصیلی تجزیے کے تحت کچھ مشاہدے درج ذیل ہیں:

اول، جدید اسلامی سائنس کا ماخذ مسلم ممالک میں کٹرپن کا احیاء ہے۔ اس کے مراکز نہ صرف پاکستان، مصر، سعودی عرب اور ملائیشیا میں موجود ہیں، یہ محض ملکوں کی سرحدوں میں محدود نہیں بلکہ مغرب میں آباد مسلمانوں میں بھی اس کا چرچا ہے۔ بدیہی طور پر یہ جدید سائنس اور اس کے کئی مظاہر کے خلاف ایک قسم کا نفسیاتی دفاع فراہم کرتی ہے، اس لئے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ اسلامی سائنس کا مظہر مستقبل قریب میں ناپید ہو جائے گا۔

دوسرے ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ اس نرالی سائنس کے پیش کرنے والے روایتی مذہبی علماء نہیں بلکہ وہ دانشور ہیں جو جدید سائنس کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نے مغرب میں تعلیم پائی ہے، تاہم ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس نے اپنے شعبہ میں امتیازی کام کیا ہو۔ ان کے لئے ”اسلامی سائنس“ ایک ایسی پناہ گاہ اور جنت ہے۔ جس میں سائنس کے شعبے میں مشکل کام کرنے کے چیلنج سے تحفظ مل جاتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ ”اسلامی سائنس“ کا مقصد غالباً ایمان کا احیاء نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمانہ وسطیٰ کے تاریک دور کی طرف واپسی کے چند سچے حامی خصوصاً متوسط طبقوں میں موجود ہیں لیکن

درحقیقت یہ ایک ایسا کھیل ہے جو ذاتی مفاد اور ترقی کے لئے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے ذریعہ فریبی اور نا اہل سائنس داں ارباب اختیار کے رجعتی مقاصد پورے کر کے اپنا الوسیدھا کر رہے ہیں۔ اعلیٰ عہدوں پر تقرر ترقی، بیرونی دوروں کے اخراجات اور دیگر مراعات ان کے مقاصد ہیں۔ ان کو سعودی عرب کی حمایت حاصل ہے۔ نقدی کے اس لامتناہی خزانے نے معجزے سرانجام دیئے ہیں۔

اسلامی سائنس کی تہہ میں کٹر علماء اور اسلام کے نام پر حکومت کرنے والے پاکستانی حکمرانوں کے درمیان تاریخی مفاہمت کا فرما ہے۔ علماء کو اسلامی سائنس اس لئے عزیز ہے کہ یہ مذہبی قانون کا دائرہ اختیار قدرتی مظاہر کے میدان تک وسیع کرتی ہے اور اس طرح دنیاوی سائنس کے بڑھتے ہوئے غلبہ کو چیلنج کرنے کا ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ اور حکمران طبقہ کے لئے یہ مذہبی جذبہ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ حکومت کی سرپرستی کے بغیر اسلامی سائنس کا وجود تک نہ ہوتا۔

لیکن ریاست کی شرکت نیم دلانہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت کے اعلیٰ افسران اسلامی سائنس کی کارروائیوں کے لئے مالی امداد دیتے ہیں اور اس کے بڑے جلسوں اور کانفرنسوں میں پر شوکت تقریریں کرتے ہیں۔ لیکن نجی محفلوں میں سائنس کو مشرف بہ اسلام کرنے کے خیال تک کا مذاق اڑاتے ہیں؛ اپنا علاج یونانی طبیوں کے بجائے ڈاکٹروں سے کراتے ہیں اور اپنے بچوں کو دینی مدارس اور اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں پڑھانے کے بجائے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھواتے ہیں۔

یہ بات پسند نہیں کی جاتی کہ پاکستانی یونیورسٹیاں نوکر شاہی کی اعانت سے بنیاد پرست طلبا کے غلبہ میں چلی گئی ہیں لیکن یہ قیمت ارباب اختیار کے لئے قابل برداشت ہے کیونکہ جلد ہی ان کے بچے کافی بڑے ہوں جائیں گے تو وہ انہیں امریکی یونیورسٹیوں میں بھیج دیں گے۔ نجی محفلوں میں پاکستان کے فوجی اور سول افسروں کے نزدیک ملا ایک مضحکہ خیز لیکن خوفناک چیز ہے۔ وہ اس کا مذاق بھی اڑاتے ہیں اور اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ مذاق اس لئے اڑاتے ہیں کہ وہ ایک ایسا عجوبہ ہے جس کی جڑیں ازمنہ وسطیٰ میں ہیں اور جس کے تفکرات و پریشانیاں جدید زمانے سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ ڈرتے اس لئے ہیں کہ اس کی تائید و حمایت

نہ ہو تو اسلام کے نام پر حکومت کرنے کا جواز ختم ہو جائے۔

ضمیمہ 2

"They Call It Islamic Science" کے زیر عنوان میرا مضمون کراچی کے Herald میگزین کے جنوری 1988ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کو پڑھ کر ان اسلامی سائنس دانوں میں سے ایک نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا جس کے اسمائے گرامی مضمون میں لئے گئے ہیں۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کا نقطہ نظر بھی اس قاری کے سامنے پیش کر دیا جائے:

”یہ خط پرویز ہود بھائی کے مضمون "They Call It Islamic Science" جو آپ کے شمارہ بابت جنوری 1988ء میں شائع ہوا ہے کے حوالے سے لکھ رہا ہوں۔ اس مضمون کے ذریعہ مصنف نے نہ صرف میرے (اور ان تمام مصنفوں کے ساتھ جو قرآن شریف اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر جدید علوم کی ترقیات کے حوالے سے کام کر رہے ہیں) بلکہ آپ کے معزز قارئین کے ساتھ بھی بڑی نا انصافی کی ہے۔ اس نے میری کتاب سے حقائق کو مسخ کر کے اور غلط حوالے دے کر ایک نہایت سنجیدہ موضوع کا تمسخر اڑانے کی کوشش کی ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ خاکہ نمبر 2 پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ میری کتاب ("Mechanics of the Doomsday and Life after Death") مطبوعہ ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن) کے خاکہ نمبر 25 کی مسخ شدہ شکل ہے۔ اپنا نقطہ نظر ثابت کرنے کے لئے جناب ہود بھائی نے اصل متن بدل دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”ایک اسلامی سائنس دان تار میں برقی رو کے سفر کی مثال کے ذریعہ اپنا یہ تصور بیان کرتے ہیں کہ کائنات کس طرح شروع ہوگی اور کس طرح ختم ہوگی اور آخر کار روح کا اشعاع عالم الاخرت اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ برقی مقناطیسی لہروں سے برقیے کا اشعاع ہوتا ہے۔“

آپ کے قارئین کے علم میں یہ بات آنی چاہیے کہ ہود بھائی نے ایک ایسی چیز پیش کر کے انہیں دھوکا دیا ہے جو کتاب میں نہیں ہے۔ میں اس صفحہ کا صحیح متن پیش کرنا چاہوں گا جس کو

ہود بھائی نے مسخ کیا ہے۔ یہ خاکہ روح کے اسلامی تصور کو بیان کرتا ہے نہ کہ ”یہ تصور کہ کائنات کس طرح شروع ہوئی اور کس طرح ختم ہوئی“۔ جیسا کہ ہود بھائی نے غلط بیان کیا ہے۔ خاکے میں برقی تمثیل جس میں سورج کو on یا off کیا جاتا ہے انسانی زندگی کے حوالے سے ہے اور کائنات کی ابتدا یا اختتام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے جیسا کہ غلط طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اس طرح ہود بھائی غلط بیانی کے مجرم ہیں۔ انہوں نے یہ غلط بیانی کرتے ہوئے اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا۔ لیکن انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، انہوں نے بعض دوسری معزز شخصیتوں کو بھی نہیں بخشا ہے۔ مثال کے طور پر ہود بھائی نے SUPARCO کے چیئر مین سلیم محمود کے علم کائنات پر مقالے کا تمسخر یہ کہہ کر اڑایا ہے کہ چیئر مین صاحب معراج کی وضاحت آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی مدد سے کرتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر کو ثابت کرنے کے لئے اصلی متن کی متعلقہ عبارت کو مسخ کیا ہے۔

کوئی بھی شخص جو متن سے مقابلہ کرے گا، اس پر واضح ہو جائے گا SUPARCO کے چیئر مین نے کیا کہا ہے اور ہود بھائی نے اس کی توجیہ کس طرح کی ہے۔ جناب محمود نے درحقیقت جو دلیل دی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ سائنسی علم اس قسم کے معجزوں کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ جناب ہود بھائی نے رپورٹنگ میں نہ صرف بے ایمانی کی ہے بلکہ جناب محمود اور ان کے زیر قیادت حکومتی محکمے کے خلاف تحقیری پھبتیوں کی جسارت بھی کی ہے۔

ہود بھائی نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ انہوں نے قرآن و سنت کے سائنسی معجزات پر بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھے گئے ارضی سائنس پر مصر کے انجینئر عبدالفتاح کے مضمون کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اس مضمون کے متن کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں جو ہود بھائی نے اس کے بارے میں کہی ہیں۔ انہوں نے اس کانفرنس (جس میں مختلف فاضل شخصیتوں اور سائنس دانوں نے ستر مقالے پیش کئے تھے) اور اس کے منتظمین کا بھی مذاق اڑایا ہے۔

کسی فلسفہ سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن شخصیتوں کا مذاق اڑانے یا ان پر چھینٹے ڈالنے یا غلط باتیں بتا کر عوام کو دھوکا دینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ جناب ہود بھائی تو اسلام اور سائنس پر کام کرنے والوں کو ”پاگل“ تک قرار دینے کی حد تک چلے گئے ہیں۔ اس طرح وہ شرافت کی

تمام حدود سے گزر گئے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں اسلام دشمن عناصر سے ایمان داری اور شرافت کی توقع کرنی چاہیے۔

ایس۔ بشیر الدین محمود

صدر نشین، ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن

اسلام آباد

مندرجہ بالا خط کے ساتھ مندرجہ ذیل جواب بھی Herald کے اپریل 1988ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا:

”میرے مضمون پر جناب بشیر الدین محمود کا رد عمل پڑھ کر میں ایک بڑی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور اس رسالے کے قاری سے معافی کا طالب ہوں۔ دراصل ”بے دھیانی میں لفظ ‘Soul’ (روح) کے بجائے لفظ ‘Universe’ (کائنات) لکھا گیا۔ اگر اس سے کوئی قاری بھٹکا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ ایک لفظ کو دوسرا سمجھ کر میں نے ایسی ہی بڑی غلطی کی جیسی کہ رخ یا رخ کے اوپر نقطہ نہ لگا کر کی جاتی ہے۔

جہاں تک نفس موضوع کا تعلق ہے مجھے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ محمود صاحب سمجھتے ہیں کہ انہوں نے روح کی تبدیلی کو تار سے برقی رو کے گزرنے سے جو تشبیہ دی ہے وہ اسلام پر مبنی ہے۔ اسلام کی یہ تفہیم یقیناً میری نہیں ان کی ہے۔ میں نے قرآن شریف اور احادیث میں برقیوں، مقناطیسی دائروں، برقیاتی مقناطیسی لہروں اور ہوائیہ کا تذکرہ کہیں نہیں پڑھا۔ محمود صاحب کے نرالے اور بے تکیے قیاسات، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اسلامی متنوں پر مبنی نہیں ہیں۔ اس لئے وہ ایک مذہبی خیال کا محض بھونڈا خاکہ ہیں۔ انہیں متنبہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے مذہب کی تضحیک نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مذہب کو احمقانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔

جناب محمود نے SUPARCO کے چیئر مین سلیم محمود کا دفاع یہ دعویٰ کر کے کیا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کی معراج کا تعلق آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت سے قائم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ غلط ہے اور میں نے جو کچھ کہا وہ صحیح ہے۔ چیئر مین کے خطبے کی وہ عبارت جو محمود صاحب

نے اپنے نقطہ نظر کی حمایت میں پیش کی ہے، وہ اس کے برعکس ہے اور معراج کے اسرار کو اضافیت سے جوڑنے کی کھلی کوشش ہے۔ اس عبارت سے ایک طرح سے خیال کے انتشار اور بے ربطی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی مجھے اپنی تفہیم کو تصور وار ٹھہرانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

جہاں تک مقدس پرتابوں (missiles) کی نوعیت کے بارے میں فتح صاحب کی تحقیق کا تعلق ہے، میں قاری کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اسلامی یونیورسٹی سے حاصل کر کے ان کے مقالے کا خود مطالعہ کرے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں غلطی کا سوال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے تو اپنے مضمون میں وہی نقل کیا ہے جو مقالے میں موجود ہے۔

ختم کرنے سے پہلے میں قاری کو اس رسالے کی یاد دلانا چاہوں گا جس کی وجہ سے ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن کے صدر جناب بشیر الدین محمود زیادہ جانے جاتے ہیں، بہ نسبت اس مماثلت کے جو انہوں نے انسانی روح اور برقیاتی مقناطیسیت کے درمیان قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی حقیقی شہرت کی وجہ وہ شائع شدہ مقالہ ہے جس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ توانائی کے مسئلہ سے دوچار دنیا کو چاہیے کہ جنات کو جنہیں خدا نے آگ سے بنایا ہے، توانائی کے وسیلے کے طور پر استعمال کرے۔

مجھے خوشی ہے کہ محمود صاحب نے مجھے اپنی لعنت ملامت کا ہدف بنایا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مضمون نے فرسودہ اور مہمل خیالات کے اعصابی مرکز پر ضرب لگائی ہے۔ گو انہوں نے مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ اسلام اور سائنس پر کام کرنے والے سب ہی لوگوں کو فریبی یا پاگل قرار دوں۔ یہ مجھ سے بعید ہے۔ لیکن، کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ فریبی یا پاگل، ڈھونگئے اور خبیثی، نلکے، احمق،۔۔۔۔۔ آج کل بھی چاروں ہاتھ پاؤں سے اس گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں جسے ”اسلامی سائنس“ کہتے ہیں۔

ڈاکٹر پرویز ہود بھائی

شعبہ طبیعیات

قائد اعظم یونیورسٹی اسلام آباد

ضمیمہ 3

اسلامی سائنس کے دعوؤں پر چند بین الاقوامی اخبارات اور رسالوں میں بحث و تجویز کا سلسلہ چل پڑا، خصوصاً وال سٹریٹ جرنل نے 13 ستمبر 1988ء کے شمارے میں صفحہ اول پر اسلامی سائنس کے موضوع سے متعلق ایک خصوصی تحقیقی مضمون شائع کیا۔ اس مضمون کا ایک حصہ جو ضمیمہ نمبر 1 میں دی گئی نزعی خط و کتابت کے حوالے سے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگا، درج ذیل ہے:

”شہر کی خاموش نواحی بستی میں مقیم ڈائریکٹر ہولی قرآن ریسرچ فاؤنڈیشن۔۔۔۔۔ سید بشیر الدین محمود نے پاکستان میں ایک طرح کی نمایاں حیثیت حاصل کر لی ہے۔ دن کے وقت محمود صاحب ایک نیوکلیائی انجینئر ہوتے ہیں؛ نیوکلیائی پلانٹ سے اخراج کا پتہ لگانے والے آلات ڈیزائن کرتے ہیں۔ رات کے وقت اسلامی نظریات گھڑتے ہیں۔“

وہ لوگ جنہوں نے محمود صاحب کی ایسی کوششوں کو ہدف تنقید بنانے کی جسارت کی ہے، کہتے ہیں کہ 1983ء میں انہوں نے اسلامی سائنس کانفرنس میں ایک مقالہ پیش کیا جس میں کہا کہ جنات (آگ سے بنی ہوئی قرآنی مخلوق) کو توانائی کی کمی کا مسئلہ حل کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ محمود صاحب کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ ”قطعاً مہمل بات ہے۔“ انہوں نے گفتگو کے دوران کہا۔

”پھر کیا کہا تھا؟“

الفاظ کے انتخاب میں احتیاط برتتے ہوئے محمود صاحب وضاحت کرتے ہیں کہ جنات توانائی سے بنے ہیں اور بادشاہ حضرت سلیمان نے وہ طریقہ معلوم کیا تھا جس سے وہ ان سے (جنات سے) کام لے سکتے تھے۔ محمود صاحب نے فرمایا: ”میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنی روح کو ترقی دیں تو ہم ان سے (جنات سے) ابلاغ کر سکتے ہیں۔“

محمود صاحب کو اس پر تعجب نہیں کہ بعض لوگ ان کے اسلامی کا ز سے ناراض ہیں۔۔۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ ”ہر نئے خیال کے مخالفین ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام اور سائنس پر اس نزعی بحث

کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اسلام اور سائنس کے درمیان کوئی مخالفت نہیں ہے۔

وضاحت

اس کتاب میں مختلف حوالہ جات دیئے گئے ہیں لیکن ان کا منج نہیں بتایا گیا۔ قاری چاہے تو انہیں حاصل کرنے کے لئے انگریزی زبان والی اشاعت Islamand Science سے رجوع کرے۔

مصنف

MashalBooks.org

MUSALMAN AUR SCIENCE

Pervez Amir Ali Hoodbhoy

Copyright © Urdu 2005 Mashal Books

Ist printing 2002

2nd printing 2003

3rd printing 2005

Publisher: Mashal Books

RB-5, Second Floor,

Awami Complex, Usman Block, New Garden Town,

Lahore-54600, Pakistan

Telephone & Fax: 04235866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

<http://www.mashalbooks.org>

Mashal is a small organization dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, it is a non-commercial and non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid giving agencies worldwide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

مشعل معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، بہتر نظم و نسق، ترقی میں خواتین کے کردار، ماحولیات، منشیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب مشعل کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔

مشعل کی کوشش ہے کہ اس کی مطبوعات وسیع پیمانے پر دستیاب ہوں۔ یہ ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے۔ چنانچہ مشعل ایسے پاکستانی اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے امداد کا خواہاں ہے جو مشعل کے اغراض و مقاصد سے اتفاق رکھتے ہوں۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

MashalBooks.org